سہ ماہی

پیغام ثقلین



ایسے نہ بنو

ایک شخص نے حضرت علیؑ سے موعظہ کا تقاضا کیا تو فرمایا: ''ان لوگوں میں نہ ہو جانا جو عمل کے بغیر آخرت کی امید رکھتے ہیں اور طولانی امیدوں کی بنا پر توبہ کو ٹال دیتے ہیں۔ دنیا میں باتیں زاہدوں جیسی کرتے ہیں اور کام راغبوں جیسا انجام دیتے ہیں۔ کچھ مل جاتا ہے تو سیر نہیں ہوتے ہیں اور نہیں ملتا ہے تو قناعت نہیں کرتے ہیں۔ جو دے دیا گیا ہے اس کے شکریہ سے عاجز ہیں لیکن مستقبل میں زیادہ کے طلب گار ضرور ہیں۔ لوگوں کو منع کرتے ہیں مگر خود نہیں رُکتے ہیں۔ اور ان چیزوں کا حکم دیتے ہیں جو خود نہیں کرتے ہیں۔ نیک کرداروں سے محبت کرتے ہیں لیکن ان کا جیسا عمل نہیں کرتے ہیں اور گناہگاروں سے بیزار رہتے ہیں لیکن خود بھی ان ہی میں سے ہوتے ہیں۔ گناہوں کی کثرت کی بنا پر موت کو ناپسند کرتے ہیں اور پھر ایسے ہی اعمال پر قائم بھی رہتے ہیں جن سے موت ناگوار ہو جاتی ہے۔ بیمار ہوتے ہیں تو گناہوں پر پشیمان ہو جاتے ہیں اور صحت مند ہوتے ہیں تو پھر لہو ولعب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بیماریوں سے نجات مل جاتی ہے تو اکڑنے لگتے ہیں اور آزمائش میں پڑ جاتے ہیں تو مایوس ہو جاتے ہیں۔ کوئی بلا نازل ہو جاتی ہے تو بشکل مضطر دعا کرتے ہیں اور سہولت و آسانی فراہم ہو جاتی ہے تو فریب خوردہ ہو کر منہ پھیر لیتے ہیں۔ ان کا نفس انھیں خیالی باتوں پر آمادہ کر لیتا ہے لیکن وہ یقینی باتوں میں اس پر قابو نہیں پا سکتے ہیں دوسروں کے بارے میں اپنے سے چھوٹے سے گناہ سے بھی خوف زدہ رہتے ہیں اور اپنے لئے اعمال سے زیادہ جزا کے امیدوار رہتے ہیں۔ مالدار ہو جاتے ہیں تو مغرور و مبتلائے فتنہ ہو جاتے ہیں اور

میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں (ثقلین) خدا کی کتاب اور اپنی عترت و اہل بیتؑ کو چھوڑ کر جارہا ہوں جب تک تم ان دونوں سے متمسک رہوگے کبھی گمراہ نہ ہوگے اور یہ دونوں میرے پاس حوض کوثر پر وارد ہونے تک ہرگز جدا نہ ہوں گے۔ مرسل اعظمؐ

سہ ماہی پیغام ثقلین نئی دہلی

مدیر: سیّد محمد عسکری ❁ معاونین: سیّد حسنین رضوی کراروی، ممتاز علی غازی پوری

مقاصد

☆ مومنین میں دینی رجحان کو فروغ دینا

☆ نسل نو کو قرآن کریم اور اہل بیتؑ کی پاکیزہ و جاودانی تعلیمات سے زیادہ سے زیادہ آشنا کرنا

☆ جدید شیعہ نسل میں دینی اور دنیوی تعلیم کو عام کرنا اور ان میں دین کی طرف سے پیدا شدہ احساس کمتری کو دور کرنا

☆ دنیا بھر میں موجود شیعہ اداروں اور تنظیموں سے روشناس کرانا

☆ اسلامی دنیا کے آثار و شخصیات کا تعارف کرانا

سالانہ بدل اشتراک		قیمت فی شمارہ ۴۰ روپے	
ہندوستان	۱۶۰ روپے	پاکستان ہوائی ڈاک	۵۰۰ روپے
دیگر ممالک ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر	پاکستان زمینی ڈاک	۳۰۰ روپے

پیغام ثقلین سے متعلق تمام قانونی کاروائی دھلی عدالت میں ہی عمل میں آئے گی "ادارہ"

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر سیّد محمد عسکری نے نیو پبلک پریس دہلی ۶ سے چھپوا کر اہل بیتؑ کلچرل کمپلیکس کالندی کنج روڈ ابوالفضل انکلیو ۲ (شاہین باغ) میں جامعہ نگر (اوکھلا) نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

سہ ماہی　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　نئی دہلی

پیغامِ ثقلین

جلد ۸　رجب، شعبان، رمضان ۱۴۲۶ھ　شمارہ ۲

خط و کتابت اور زر اشتراک بھیجنے کا پتہ:
''اہل بیت کلچرل کمپلکس''، کالندی کنج روڈ، ابوالفضل انکلیو۔ II
(شاہین باغ) جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 فون نمبر ۵۵۷۸۶۷۰۴، ۲۹۹۴۰۱۹۰
موبائل: ۹۸۱۸۲۳۸۳۶۴۔ ای میل: ahlebait2002@yahoo.co.in

مطابق اگست، ستمبر، اکتوبر ۲۰۰۵ء

فکر و نظر

نقوش عصمت

پاسبان تشیع

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ادارہ کا مقالہ نگار کی ہر رائے سے اتفاق ضروری نہیں ہے۔ مندرجات ''پیغام ثقلین'' نقل کرنے کی اجازت ہے لیکن رسالہ کا حوالہ ضروری ہے۔

میڈیا کی شرارت اور ہماری ذمہ داری

ان دنوں ذرائع ابلاغ نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو زہریلا ماحول تیار کیا ہے وہ محتاج بیاں تو نہیں ہے تاہم اس کے اسباب وعلل اور اس سے نمٹنے کے طریقۂ کار کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

مبیّنہ دہشت گردی ہو یا خواتین سے وحشیانہ وانسانیت سوز برتاؤ، صیہونی میڈیا اور اس سے متاثر، کمزور مگر مفاد پرست پرنٹ یا الیکٹرونک ذرائع ابلاغ، ان سب لعنتوں کو اسلام اور مسلمانوں سے وابستہ کرنے پر کمربستہ ہیں اور اپنے اس ناپاک مقصد کے حصول کے لئے کسی ایسے معمولی سے معمولی ناخوشایند واقعہ کو استعمال کرنے سے نہیں چوکتے جس سے خالد، داؤد، سلیم، عمرانہ، شہبانو، رخسانہ وغیرہ جیسے مسلم نام جڑے ہوئے ہوں۔ وہ اس طرح کے واقعات میں رائی کا پہاڑ بنانے کے لئے اپنی ساری شیطانی طاقت اور سارا زور زبان وقلم جھونک دیتے ہیں جبکہ ان سے کہیں زیادہ شرمناک اور انسانیت سوز واقعات کو نظرانداز بلکہ دبانے کی پوری کوشش کرتے ہیں جن کے کرداروں کے نام مسلم ناموں سے مشابہت نہیں رکھتے۔

ہمیں صیہونی ذرائع ابلاغ سے اس کے سوا کوئی امید بھی نہیں رکھنی چاہئے۔ ان کا فلسفۂ وجود ہی یہی ہے۔ وہ ہر اس شخص اور قوت کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے ہیں جو ان کے ناپاک عزائم اور ناجائز مقاصد کی راہ میں مزاحمت کرتی ہے۔ لہٰذا ان سے شکوہ وشکایت اور گفتگو ومذاکرہ میں اپنا وقت ضائع کرنا دانشمندی نہیں ہے۔

ہمیں اپنی توجہ اور توانائی اس طرف مرکوز کرنی چاہئے کہ:

۱) ہم (عوام اور لیڈر) اپنے قول وفعل کے ذریعہ انسانیت دشمنوں کو اپنا شیطانی کھیل کھیلنے کا کوئی موقع فراہم نہ کریں۔ کسی حادثہ میں زبان کھولنے سے پہلے ــــ خصوصاً میڈیا کے سامنے ــــ واقعہ کے تمام پہلوؤں کا اچھی طرح جائزہ لیں اس کی صحت وسقم کو پرکھیں اس کے متعلق اسلام کے حقیقی نظریہ کو سمجھیں شخص اور فرقہ کی سطح سے بلند ہو کر اسلام کے مفاد کو سوچیں۔ میڈیا میں

نام درج کرانے اور اسکرین پر نظر آنے کے شوق میں لاشعوری طور پر دشمن کے مقاصد کو فائدہ پہچانے والے بیان نہ دے بیٹھیں۔ یادرکھیں صیہونی میڈیا اور اس کے ھمنوا آپ کے چشم وابرو کے شیدا نہیں ہیں وہ حقیقت کی ترجمانی کے لئے آپ کے پاس نہیں آتے بلکہ آپ سے اپنی بات کہلوانے کے لئے آپ کو استعمال کرتے ہیں۔آپ کا بیان دم بریدہ شکل میں توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی کوشش کریں گے اور صرف ان ہی جملوں کا انتخاب کریں گے جنھیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے۔لہٰذ ھم پرنٹ یا الیکٹرانک میڈیا پر اسلام کی ترجمانی کا فریضہ ان ہی لوگوں پر چھوڑ دیں جو اس کے اہل ہیں۔میڈیا سے نمٹنے کا فن جانتے ہیں ،اسلامی تعلیم وقوانین کے ماہر ہیں ملکی وعالمی حالات ومسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں نڈر اور بیباک ہیں،خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔اگر چہ میڈیا ایسے افراد کو نظر انداز اور انہیں گوشۂ گمنامی میں رکھنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔

۲) صیہونیت یا ھندتو کا نعرہ لگانے والے مٹھی بھر شیطانوں اور ان کے آلہ کاروں کے سوا بقیہ عوام بھولی بھالی اور پاک فطرت کی حامل ہے وہ کورے کاغذ کے مانند ہے۔جس کا قلم پہلے چل جائے اسی کی تحریر ثبت ہوجائے گی۔اگر ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو شیطانی طاقتیں اپنے زہریلے پروپیگنڈہ سے ان کے ذھنوں کو مسموم کرتی رہیں گی،خانہ خالی را دیو می گیرد۔لہٰذ فرعی وغیر اہم باتوں میں الجھنے کے بجائے تنویر فکر وذہن کی مہم شروع کریں۔اپنے وسائل اور صلاحیتوں کو یکجا کر کے طاقتور میڈیا تشکیل دیں اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کے بجائے یک دل ویک زباں ہوکر صاف ذہن بے غرض افراد۔۔ ہندو، سکھ، عیسائی، یہودی، بودھ، جین......۔کو حقایق عالم وتعلیمات اسلام سے روشناس کرائیں۔

گھر میں بیٹھ کر دشمن کو صرف کوسنے سے کچھ نہ ہوگا۔معذرت خواھانہ کمزور موقف ۔جو گذشتہ دنوں ھم نے پیش کیا۔ھمیں کمزور سے کمزور تر بنادے گا۔ھمیں اپنی اسلامی بنیادوں کی صحیح معرفت حاصل کر کے سیسہ پلائی دیوار کی طرح ڈٹ جانا چاہئے۔اپنے اندر اتنی دفاعی طاقت پیدا کرلینی چاہئے کہ باد مخالف کے مسموم جھونکے اپنی جگہ سے ہلا نہ سکیں۔ھمیشہ ھمارے دشمن ہی ھم سے سوال کیوں کریں؟ ھمیں بھی آگے بڑھ کر انھیں کٹہرے میں کھڑا کرنا چاہئے؟



ابھی کچھ دنوں کی بات ہے کہ چرتھاول ضلع مظفر نگر کے جس شرمناک واقعہ کو میڈیا نے پوری آب وتاب کے ساتھ پیش کر کے اسلام کو کٹہرے میں کھڑا کرنے کی کوشش کی اور مفاد پرست

ابن الوقت سیاست بازوں نے مگر مچھ کے آنسو بہائے۔ بد قسمتی سے اس کے کردگار بھی عمرانہ، علی محمد اور نور الٰہی جیسے مسلم نام تھے۔ اسلام دشمنوں یا غیر مسلموں نے جو رنگ دکھایا وہ اپنی جگہ، لیکن خود مسلمانوں نے جو شرمسار موقف اختیار کیا وہ بڑا ادلدوز تھا۔ کسی نے میڈیا کے پروپیگنڈہ کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے اسلام کی من مانی تاویل پیش کرنا شروع کردیا تو کسی نے اسے دوسرے فرقہ پر حملہ کرنے کا بہترین موقع تصور کیا اور کسی نے حقایق سمجھے اور معاملہ کی نزاکت جانے بغیر فتوٰی کی اہلیت نہ رکھتے ہوئے بھی فتووں کی برسات شروع کردی۔ دینی بنیادوں اور مسائل سے لاعلمی کے باوجود میڈیا کے ہر سوال کا جواب دینا فرض عین سمجھا۔ مذہبی چہرہ اور لمبی داڑھی، مفتی ہونے کی دلیل بن گئی۔ کوئی اس لئے فتوٰی صادر کررہا ہے کہ وہ حج کر آیا ہے۔

میڈیا نے ہر اس شخص کو مفتی و قاضی کا لقب دیدیا جو اپنی احمقانہ باتوں سے اس کے لئے گرما گرم مسالہ فراہم کرسکتا تھا۔

حقائق جاننے اور اس کی بنیاد پر اسلامی نظریہ پیش کرنے کی خال خال ہی کوشش عمل میں آئی اور حسب توقع میڈیا میں اس کی پزیرائی بھی نہیں ہوئی۔

غیر جانبدار ذرائع کی تحقیق کے مطابق اصل واقعہ ہی مشکوک ہے میڈیا نے جو کچھ جس کیفیت کے ساتھ بیان کیا وہ غلط ہے۔ اور بفرض محال، اگر ایسا کوئی واقعہ رونما بھی ہوا ہے تو امکانِ عمل کی مجبوری کے پیش نظر آئین ہند میں دی گئی مذھبی آزادی کے دائرہ میں رہتے ہوئے ہر شخص کو اپنے دینی فریضہ پر عمل کرنا ہے۔ کسی دوسرے کو اس کے مسائل میں ٹانگ اڑانے کا کیا حق ہے؟ مذہبی معتقدات کی بنیاد پر اس کے عمل کا مذاق اڑانا اور اسے جارحانہ پروپیگنڈہ کا نشانہ بنانا کہاں کی شرافت ہے؟

عمرانہ، علی محمد اور نور الٰہی تینوں حنفی ہیں۔ انھیں نکاح، طلاق اور میراث وغیرہ کے مسائل میں آئین ہند نے حنفی فقہ کے مطابق عمل کرنے کی آزادی دی ہے۔ وہ اپنے مذھبی معتقدات کے مطابق حنفی فقہ کے پابند ہیں اور حنفی فقہ کی روشنی میں ـــ اگر مذکورہ واقعہ کو صحیح مان لیا جائے جو صحیح نہیں ہے ـــ عمرانہ اپنے شوہر کے ساتھ ازدواجی زندگی کو جاری نہیں رہ سکتی۔ جب تک وہ دونوں حنفی مسلک کے پیرو ہیں ان کے لئے کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اس میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ ایک بڑی معمولی سی بات ہے ـــ اگرچہ جعفری شیعہ فقہ اس کے خلاف ہے، جس پر آئندہ سطور میں روشنی ڈالی جائے گی ـــ کسی دوسرے کو ان کی مذھبی آزادی میں دخل اندازی اور مگر مچھ کے آنسو بہانے کا قطعی حق نہیں ہے۔

اب رہی یہ بات کہ اس میں عمرانہ کا کیا قصور ہے اسے کیوں سزا دی جارہی ہے؟ سزا تو سسر کو ملنی چاہئے تھی، سنگسار تو علی محمد کو کرنا چاہئے۔ یقینا سنگسار علی محمد کو کرنا چاہئے۔ ثبوت جرم کے بعد۔۔ لیکن سزانہ ملنا یہ قوانین ہند کے باعث ہے۔ اسلامی قوانین کا قصور نہیں ہے۔ ہندوستانی قانون اس کی اجازت نہیں دیتا اگر اعتراض مقصود ہے تو تعزیرات ہند پر کیجئے۔ جہاں تک عمرانہ کو سزا ملنے کا سوال ہے تو شوہر سے جدائی سزا نہیں ہے بلکہ ایک عمل کا قہری نتیجہ ہے۔ ایسے کتنے ہی خاندان اور اشخاص ہیں جنھیں کسی جرم و گناہ کے بغیر، مصائب و آلام سے گزرنا پڑتا ہے۔

فرض کیجئے کسی شخص نے چند بے گناہ افراد کو قتل کر دیا۔ وہ گرفتار کر کے عدالت میں لایا جاتا ہے۔ قاتل کے بوڑھے ماں باپ ہیں۔ جوان بیوی اور چند چھوٹے چھوٹے معصوم بچے ہیں۔ وہ ان سب کی روزی روٹی کا ذمہ دار اور ماں باپ کے بڑھاپے کا واحد سہارا ہے، اگر عدالت اسے پھانسی یا عمر قید کی سزا سنائے گی تو ان سے ان کا اکلوتا سہارا چھن جائے گا۔ ان بچوں کے سر پر دست شفقت کون پھیرے گا؟ یہ جوان عورت کس کی چوکھٹ پر جائے گی۔۔۔؟ اس طرح کے سینکڑوں رحم لانہ سوال اٹھیں گے۔ کیا عدالت ان جذباتی سوالوں کے پیش نظر اس قاتل کو چھوڑ دے گی یا اسے سزا سنا کر ان تمام سوالوں کو تشنۂ جواب رہنے دے گی کہ جرم تو اس ایک شخص نے کیا تھا اس کے بوڑھے والدین کا کیا قصور تھا کہ ان سے بڑھاپے کی لاٹھی چھین لی گئی، معصوم بچوں کی کیا خطا تھی کہ ظالم عدالت نے ان کے سر سے باپ کا سایہ چھین لیا۔ اس بے گناہ عورت کا کیا گناہ تھا جسے رنڈ سالہ پہنا دیا گیا؟؟!

یاد رکھیں قانون اور جذبات دو الگ الگ چیزیں ہیں انھیں اگر آپس میں مخلوط کر دیا جائے گا تو دنیا کی کوئی عدالت کسی مجرم کو سزا نہیں سنا سکتی۔ کیونکہ ہر جرم میں کچھ بے گناہ بھی زد میں آہی جاتے ہیں۔ یہ دنیاوی زندگی کی محدودیت کی مجبوری ہے۔ البتہ اسلام نے مجرم سے وابستہ بے گناہوں کے مصائب و آلام میں تخفیف اور انھیں راحت پہنچانے کی کچھ تدبیریں بھی کی ہیں جن پر عمل کر کے مذکورہ منفی اثرات سے کافی حد تک محفوظ رہا جا سکتا ہے۔

○

مذکورہ واقعہ میں جہاں تک شیعی اسلام اور مکتب اہل بیت علیہم السلام کا تعلق ہے: اس کی روشنی میں اوّلاً مذکورہ عمل ہی ثابت نہیں ہے۔ جن گواہوں اور شہادت کی ضرورت ہے وہ یہاں مفقود ہے۔ کسی ایک شخص کے دعوے یا میڈیا اور وہ بھی فاسق میڈیا کی ہیا ہو سے کوئی عمل پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتا اور اگر بالفرض مبینہ عمل ثابت بھی ہو جائے۔ چاہے بالجبر یا بالرضا۔

(باقی ص ۲۸ پر)

قرآنی معلومات

زمین پر مومنوں کی جانشینی

وعد الله الذین آمنوا منکم و عملوا الصالحات لیستخلفنّهم فی الارض کما استخلف الذین من قبلهم و لیمکنّنّ لهم دینهم الذی ارتضیٰ لهم و لیبدلنّهم من بعد خوفهم امنا یعبدوننی ولا یشکرون بی شیئاً و من کفر بعد ذٰلک فاولٰئک هم الفاسقون. (سورہ نور/۵۵)

اللہ نے تم میں، سے صاحبان ایمان وعمل صالح سے وعدہ کیا ہے کہ انھیں روئے زمین پر اسی طرح اپنا جانشین بنائے گا جس طرح ان سے پہلے والوں کو بنایا ہے اور ان کے فائدہ کے لئے ان کے اس دین کو غالب بنائے گا جسے ان کے لئے پسندیدہ قرار دیا ہے اور ان کے خوف کو امن سے تبدیل کر دے گا کہ وہ سب صرف میری عبادت کریں گے اور کسی طرح کا شرک نہ کریں گے اور اس کے بعد بھی کوئی کافر ہو جائے تو درحقیقت وہی لوگ فاسق و بدکردار ہیں۔

اس آیت شریفہ میں نیک اور صالح مومنوں سے پکا وعدہ کیا گیا ہے کہ دنیا میں ظلم وستم، کفر والحاد پھیل جانے کے بعد، اللہ ان صالح مومنین کے لئے ایک آئیڈیل سماج وجود میں لائے گا۔ کرۂ ارض ان کے قبضہ میں ہوگا پوری دنیا میں ان ہی کی حکمرانی ہوگی۔ ہر طرف ان کے دین کا بول بالا ہوگا۔ خوف و ناامنی کے بجائے امن وسکون کی فضا ہوگی۔ وہ کفار ومشرکوں سے بے خوف ہو کر، آزادانہ خدا کی عبادت کریں گے۔

اس آیت میں اللہ نے اپنے اس وعدہ کو دوہری تاکید سے بیان فرمایا ہے ایک لام تاکید کے ذریعہ جو مفہوم قسم کے ہمراہ ہے اور دوسرے نون تاکید ثقیلہ کے ذریعہ تاکہ کسی شخص کے لئے کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔ اور پھر یہی دوہری تاکید "لیمکنن" میں دوہرائی گئی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ پورے کرہ ارض پر دین اسلام کا غلبہ یقینی ہے۔ تیسری مرتبہ پھر دوہری تاکید کے ساتھ یہ وعدہ کیا ہے کہ ان کے دلوں سے خوف وہراس کا خاتمہ کر کے انھیں پرسکون زندگی کی نعمت سے نوازے گا اس آیت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ زمین پر مومنوں کی حکومت سے پہلے یہ دنیا خوف وناامنی سے لبریز ہوگی۔

آیت کی شان نزول کیا ہے اور وہ کون سے لوگ ہیں جنھیں خدا پورے کرۂ ارض کا اقتدار عطا کرے گا؟ مفسروں کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض سنی مفسروں نے اس آیت کو اپنے چار خلفاء راشدین پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن آیت کی عمومیت ان کے اس دعوے کی تصدیق نہیں کرتی۔ علاوہ بریں رسول خدا کی رحلت کے بعد مومنوں کو کبھی بھی امن وامان نصیب نہیں ہوا یہاں تک کہ رسول خدا سے سب سے زیادہ قربت رکھنے والے افراد یعنی آپ کے اہل بیتؑ بھی اس خوف،

ناامنی سے مستثنیٰ نہیں تھے خود ان حکمرانوں ہی نے انھیں ظلم وستم کا نشانہ بنایا ہوا تھا۔ نہ ان کی جان محفوظ تھی نہ ان کا مال۔ لہٰذا اس آیت سے یقیناً کوئی دوسرا زمانہ مراد ہے۔

ائمہ طاہرین سے منقول روایتیں، اس آیت کو حضرت امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی عالمی حکومت کی طرف اشارہ مانتی ہیں کہ مشرق سے، مغرب تک پورا کرۂ ارض آپ کی حکومت کے زیر نگیں ہوگا۔ دنیا سے خوف، اضطراب، ناامنی کا مکمل طور پر خاتمہ ہو جائے گا مسلمین، پوری آزادی کے ساتھ اللہ کی عبادت کریں گے۔

رسول خدا کی یہ حدیث جو شیعہ سنی دونوں ذرائع سے نقل ہوئی ہے اس دعوے کی تصدیق کرتی ہے:

لو لم یبق من الدنیا الا یوم واحد لطوّل الله ذالک الیوم حتی یلی رجل من عترتی اسمه اسمی یملاء الارض عدلا و قسطا کما ملئت ظلما و جورا۔

اگر دنیا کی عمر صرف ایک دن باقی رہ گئی ہو خدا اس دن کو اتنا طولانی بنا دے گا کہ میرے اہل بیت کی ایک فرد جس کا نام میرا نام ہوگا؛ دنیا کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے کر اسے عدل وانصاف سے اسی طرح بھر دے گا جیسے وہ ظلم وستم سے بھری ہوئی ہوگی۔

امام زین العابدینؑ اس آیت کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں:

هم والله شیعتنا اهل البیت یفعل الله ذلک بهم علی یدی رجل منا و هو مهدی هذه الامه یملاء الارض عدلا و قسطا کما ملئت ظلما و جورا۔

اللہ کی قسم وہ ہمارے شیعہ ہیں اللہ انھیں ہمارے خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک شخص کے ذریعہ جو اس امت کے مہدی ہیں زمین کا اقتدار عطا کرے گا اور مہدی زمین کو اسی طرح عدل وانصاف سے بھر دیں گے جس طرح وہ ظلم وجور سے بھری ہوگی۔

تفسیر نور الثقلین میں ایک طویل روایت نقل ہوئی ہے جس میں امام جعفر صادقؑ نے اس آیت کو حضرت قائم عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے زمانہ سے مخصوص جانا ہے۔ حدیث کے راوی مفضل نے امام کے اس بیان کے بعد، عرض کیا کہ اے فرزند رسول خدا، ناصبیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ آیت، خلفاء اربعہ کے بارہ میں نازل ہوئی ہے۔ حضرت نے فرمایا: خدا ناصبیوں کے دل کی ہدایت نہ کرے، تینوں خلفاء یا حضرت علی کے زمانہ خلافت میں کب ایسا وقت آیا کہ خدا اور رسول کا پسندیدہ دین پوری دنیا میں پھیل گیا ہو اور امت کسی خوف وہراس کے بغیر امن وامان کے ساتھ خدا کی عبادت میں مشغول رہی ہو۔ یہ دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے کہ جب کہ اس دور میں مسلمانوں کے درمیان ارتداد آپسی جنگ وخونریزی اور فتنہ وفساد کا بازار گرم تھا۔

بہر صورت حدیثوں کی روشنی میں ہمیں یقین ہے کہ یہ آیت، امام زمانہ سلام اللہ علیہ کے ظہور اور آپ کی عالمی حکومت کی بشارت دے رہی ہے خدا ہمیں آپ کے ہمراہ آپ کے دشمنوں سے جنگ و شہادت کی توفیق عنایت فرمائے۔ موجودہ حالات سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا ظہور نزدیک ہے۔

اس کے قتل کا حکم دینے والے کو عمر قید کی سزا دی جائے گی۔

۳) بار بار چوری: اگر کوئی شخص بار بار چوری کرتا ہے تو اسے تیسری بار چوری کرنے کے جرم میں عمر قید کی سزا دی جائے گی۔ یہ حکم امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے اصحاب کی ایک جماعت نے ان دونوں اماموں سے نقل کیا ہے[1]

۴) مرتد فطری عورتیں: یہ عورتیں اگر توبہ کرنے کے لئے تیار نہ ہوں تو ان کی سزا بھی عمر قید ہے امام باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے:

والمرأة اذا ارتدت عن الاسلام استتیبت فان تابت والا خلدت فی السجن[2]

مرتد عورت سے توبہ کرنے کو کہا جائے گا اگر وہ توبہ کر کے اسلام کی آغوش میں پناہ لے لے تو آزاد کر دی جائے گی ورنہ اسے عمر قید کی سزا دی جائے گی۔

مذکورہ بالا جرائم کے علاوہ کچھ اور جرائم کے لئے بھی عمر قید کی سزا فقہی کتابوں میں بیان کی گئی ہے تفصیلات ان کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

عارضی و وقتی قید جو تعزیری سزاؤں کا عنوان رکھتی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے اس کا تعلق، جرم کی نوعیت اور مجرم کی قوت برداشت سے اور کچھ دوسرے حالات سے ہے۔

جن لوگوں پر قتل کا الزام ہے اور ان کے بھاگ جانے کا اندیشہ ہے۔ جو قاتل کو جرم ثابت ہو جانے کے بعد بھاگنے میں مدد دیتے ہیں۔ وہ حاملہ عورت جس کا زنا کرنا ثابت ہو گیا ہے اور اس کے بھاگ جانے کا خطرہ ہے اسے بھی بچہ کی ولادت اور حد جاری ہونے تک قید رکھا جائے گا۔ جس نے غیر محفوظ جگہ (غیر حرز) سے چوری کی ہے وہ مقروض جو استطاعت کے باوجود قرض ادا کرنے پر تیار نہیں ہے۔ جھوٹے گواہ۔ مجرم کی ضمانت لینے والا جب تک مجرم خود کو عدالت کے سپرد نہیں کر دیتا قید میں رہے گا۔ وہ گناہگار جو جیل کی ہوا کھائے بغیر اپنے گناہوں سے باز نہیں آ سکتے یہ سب وقتی و عارضی قیدی ہیں۔

قیدیوں سے انسانی برتاؤ

تاریخ گواہ ہے کہ ظالم حکمرانوں نے جیل اور قید و بند سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے

۱۔ وسائل، جلد ۱۸، ص ۴۹۲، باب ۵، از ابواب حد السرقہ ۲۔ وسائل، جلد ۱۸، ص ۵۴۹، باب ۴، از ابواب حد المرتد۔ حدیث [illegible]

آسے اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لئے استعمال کیا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسانی وسماجی نقطۂ نظر سے جرائم کے انسداد اور مجرموں کی تربیت کے لئے جیل ایک ضرورت ہے لیکن اسے کچھ اصول وقوانین کے دائرہ میں رکھنا بھی ضروری ہے۔ تاکہ اس کے ناجائز استعمال کا دروازہ بند کیا جاسکے۔

جیل کی ایک لازمی شرط یہ ہے کہ قیدیوں کے سلسلہ میں تمام انسانی اقدار کا خیال رکھا جائے۔ انھیں ایک انسان سمجھتے ہوئے ان کے ساتھ انسانی برتاؤ کیا جائے۔ ان پر ظالمانہ دباؤ نہ ڈالا جائے۔ کسی کو دوسرے کے جرم کی سزا میں قید نہ کیا جائے۔ کسی کو اپنے حق سے زیادہ ایک لمحہ کے لئے بھی جیل میں نہ رکھا جائے۔ جیل میں انجام پانے والا ہر عمل اور ہر منصوبہ، قیدیوں کی تعلیم وتربیت کو مدنظر رکھتے ہوئے انجام پانا چاہئے۔ جیل نہ مجرموں کو پروان چڑھانے کا مرکز ہے اور نہ انتقام لینے کا اڈہ۔ بلکہ انسانی اقدار کی درس گاہ ہے اور اس میں ایسی ہی درس گاہ کی خصوصیتیں پائی جانی چاہیے۔

مصر کے قید خانہ میں حضرت یوسف کے قید ہونے کے واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جیلیں اتنی ظالمانہ تھیں کہ قیدیوں کو جیل میں ڈال کر بھول جاتے تھے انھیں یاد بھی نہیں رہتا تھا کہ ان کی جیل میں فلاں نام کا قیدی بھی موجود ہے۔ صرف کوئی اتفاق یا کوئی حادثہ ہی ان ظالموں کو ان مظلوم قیدیوں کی یاد دلاتا تھا اور وہ حادثہ رونما نہ ہوتا تو شاید پوری عمر اسی قید خانہ میں پڑے رہتے۔ اگر حضرت یوسف کے پاس تعبیر خواب کا علم نہ ہوتا اور اگر عزیز مصر نے وہ معروف خواب نہ دیکھا ہوتا اور اس کی تعبیر کے لئے اسے حضرت یوسف کی ضرورت نہ ہوتی اور ایک آزاد شدہ قیدی کے ذریعہ جناب یوسف تک اس کی رسائی نہ ہوتی تو شاید حضرت یوسف اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اسی جیل میں پڑے رہتے۔ حالانکہ وہ بے گناہ تھے وہ کسی جرم کے مرتکب نہیں ہوئے تھے۔ ان کا گناہ بس اتنا تھا کہ انھوں نے عزیز مصر کی بیوی زلیخا کی ھوس آلود، ناجائز خواہشوں کے سامنے سر نہیں جھکایا تھا، اپنے تقویٰ و پاکدامنی کا سودا نہیں کیا تھا۔ البتہ گناہ گاروں اور بدکاروں کی نظر میں یہ کوئی معمولی گناہ نہیں ہے!!

قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ حضرت یوسف نے ممکنہ حد تک اس قید خانہ کو مرکز تعلیم و

تربیت، اصلاح نفس اور درس توحید و خدا پرستی میں تبدیل کر دیا تھا جو تمام اچھائیوں کی جڑ ہے۔ توحید و خدا پرستی، انسان کو جرائم کی دنیا سے دور رکھنے میں بہترین و موثر ترین کردار ادا کرتی ہے۔ جب بھی حضرت یوسف سے کوئی معمولی سوال بھی کرتا تھا۔ مثلاً خواب کی تعبیر پوچھتے تھے۔ آپ فوراً الٰہی معارف و تربیتی مسائل بیان کرنے لگتے تھے اور فرماتے تھے:

یاصاحبی السجن ء ارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القھار؟ ماتعبدون من دونہ الا أسماءً سمیتموھا أنتم و آبائکم ماانزل اللہ بھا من سلطان ان الحکم الا للہ امرا لا تعبدوا الا ایاہ ذلک الدین القیم و لکنّ أکثر النّاس لایعلمون۔ (یوسف/۳۹، ۴۰)

اے میرے جیل کے ساتھیو! کیا متفرق اور بکھرے ہوئے خدا بہتر ہیں، یا خدائے واحد وقہار؟ تم لوگ اس خدا کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے وہ صرف ایسے نام ہیں جو خود تم نے اور تمھارے آباء و اجداد نے رکھا ہے۔ اللہ نے ان کے بارے میں کوئی دلیل نازل نہیں کی ہے جبکہ حکم کرنے کا حق صرف اللہ کو ہے۔ اس کا فرمان ہے کہ اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کی جائے یہی ہے سیدھا اور مستحکم دین۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

یہ صحیح ہے کہ حضرت یوسف، خود ایک قیدی تھے۔ لیکن ان کا عمل یہ بتاتا ہے کہ اگر وہ حاکم بھی ہوتے تو قید خانہ کو الٰہی تعلیم و تربیت کے مرکز میں تبدیل کرنے کی اور بھی زیادہ کوشش کرتے تاکہ قیدیوں کو قید میں فرصت کے جو لمحات میسر ہوئے ہیں اسے وہ اپنے ماضی و حال کا جائزہ لینے، اپنے افکار و نظریات پر نظر ثانی کرنے اور اپنی تعمیر جدید میں صرف کریں۔

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ بہت سے شر پسند مجرمین قید خانہ میں اچھی صحبت مل جانے کے باعث نیک بن گئے، بڑی تیزی کے ساتھ ان کی اصلاح ہوگئی۔ کیونکہ جیل سے باہر انھیں اپنے بارہ میں سوچنے اور اپنے اعمال پر نظر ثانی کا موقع نہیں ملتا تھا۔ جیل ان کے لئے توفیق اجباری ثابت ہوئی۔

حدیثوں میں قیدیوں کے حقوق، انھیں نماز جمعہ میں چھٹی دینے اور اپنے عزیزوں دوستوں سے ملاقات کی اجازت دینے کے سلسلے میں کافی تاکید کی گئی ہے۔ امام جعفر صادق سے یہ

حدیث نقل کی گئی ہے کہ:

علی الامام أن یُخرج المُحبَسین فی الدَّین یوم الجمعة الی الجمعة و یوم العید الیٰ العید فیرسل معهم فاذا قضوا الصلوة و العید ردّهم الی السجن.۱

امام پر فرض ہے کہ جو لوگ قرض ادا نہ کرنے کے باعث جیل میں بند ہیں انھیں جمعہ کے دن نماز جمعہ کے لئے اور عید کے دن نماز عید کے لئے محافظوں کے همراہ بھیجے تا کہ نماز جمعہ اور عید کے مراسم ختم ہو جانے کے بعد محافظین ان قیدیوں کو جیل میں واپس لائیں۔

قابل غور ہے یہ بات کہ نماز جمعہ اور نماز عید دونوں میں، دو دو خطبے ہوتے ہیں جو غیر معمولی تربیتی اثر رکھتے ہیں:

ایک دوسری حدیث میں فرماتے ہیں:

انّ علیًا علیه السلام کان یُخرج اهل السجون، مَن حُبس فی دین اوتهمة الی الجمعة فیشهد و نهاو یضمّنهم الاولیاء حتی یردّوهم ۲

حضرت علی ان قیدیوں کو جو قرض ادا نہ کرنے یا کسی اور الزام میں جیل میں بند ہوتے تھے نماز جمعہ میں بھیجتے تھے تا کہ وہ نماز جمعہ میں شرکت کر سکیں اور ان کے سرپرستوں سے انھیں جیل میں واپس لانے کی ضمانت لیتے تھے۔

ایک اور حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علی جمعہ کو جیل میں جا کر قیدیوں کا جائزہ لیتے تھے جو حد جاری کئے جانے کے منتظر ہوتے تھے ان پر حد جاری کرتے تھے۔ اور جو کسی حد کے مستحق نہ ہوتے انھیں آزاد کر دیتے تھے۔۳

آیات، روایات اور احکام و قوانین سے قید و قیدی سے متعلق ایک جامع قانون تیار کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر:

۱) جس وقت حضرت علی کے قاتل عبدالرحمان ابن ملجم کو گرفتار کر کے لایا گیا امام نے اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کا حکم دیا۔ اپنے بیٹوں اور اصحاب سے فرمایا:

۱) وسائل، جلد ۱۸، ص ۲۲۱ ۲) مستدرک الوسائل جلد ۲، ص ۲۰۳ ۳) میزان الحکمۃ، جلد ۲، ص ۲۵۰

اطعموه و اسقوه وأحسنوا أساره[۱]

اسے کھانا کھلاؤ اور سیراب کرو اور قید میں اسے اچھے طریقہ سے رکھو۔

مشہور یہی ہے کہ جس وقت امام کا سر مبارک شگافتہ ہو چکا تھا۔ بستر پر پڑے ہوئے تھے کبھی بے ہوش ہوتے تھے تو کبھی ہوش میں آتے تھے، امام حسنؑ نے دودھ کا پیالہ آپ کی خدمت میں پیش کیا حضرت نے تھوڑا سا دودھ نوش فرمایا اور بقیہ دودھ ابن ملجم کو پلانے کا حکم دیا۔[۲]

علامہ مجلسی نے یہ حدیث بھی نقل فرمائی ہے کہ جس وقت ابن ملجم کو قید کر کے حضرت علیؑ کی خدمت میں لایا گیا آپ نے کچھ باتیں ابن ملجم سے کہیں اور پھر اپنے فرزند امام حسنؑ سے فرمایا:

ارفق یا ولدی باسیرک وارحمه وأحسن الیه و اشفق علیه ألا تری الی عینیه قد طارقا الیٰ ام راسه و قلبه یرجف خوفا و رُعبا و فزعا، فقال له الحسنؑ یا أباه! قد قتلک هذا اللعین الفاجر و أفجعنا فیک و أنت تأمرنا بالرّفق به؟! فقال له نعم یا بُنیّ نحن اهل بیت لانزداد علی الذنب الینا ألّا کرما و عفوا و رحمة والشفقه من شیمتنا لا من شیمته، بحقّی علیک فاطعمه یا بنیّ ممّا تأکله و اسقه ممّا تشرب ولا تقید له قدما و لا تغلّ له یداً۔[۳]

بیٹا! اپنے قیدی کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ اس پر رحم کرو نیکی کا برتاؤ کرو۔ دیکھ نہیں رہے ہو کہ خوف سے اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی ہیں اور رعب و وحشت سے اس کا دل لرز رہا ہے؟!

امام حسنؑ نے عرض کیا: بابا! اس ملعون نے آپ پر قاتلانہ حملہ کیا ہے اور ہمیں اس عظیم مصیبت میں مبتلا کیا ہے اور آپ اس سے نرمی سے پیش آنے کی بات کر رہے ہیں؟!

حضرت نے فرمایا: ہاں بیٹا! ہم اس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو مجرموں کے جرم کا جواب عفو و کرم اور محبت و شفقت سے دیتے ہیں۔ یہ ہم لوگوں کا شیوہ ہے اس کا نہیں۔ میں تمہیں اپنے حق کی قسم دیتا ہوں جو کچھ تم کھاؤ اسے بھی وہی کھلاؤ جس چیز سے تم سیراب ہو اسی چیز سے اسے بھی سیراب کرو۔ اسے زنجیر میں نہ جکڑو، اس کے ہاتھ بھی نہ باندھو۔

۱) بحار الانوار، جلد ۴۲ ص ۲۳۹ ۔ ۲) بحار الانوار، جلد ۴۲ ص ۲۸۹ ۔ ۳) بحار الانوار، جلد ۴۲ ص ۲۸۷، ۲۸۸

۲) شیخ طوسی اپنی کتاب خلاف میں فرماتے ہیں:

"اگر کوئی شخص کسی چھوٹے بچہ کو پکڑ کر از روئے ظلم قید کردے اور اس پر دیوار گر پڑے یا کوئی درندہ جانور اس بچہ کو پھاڑ کھائے یا سانپ اسے ڈس لے، بچھو اسے ڈنک مار دے تو قید کرنے والا اس کے خون کا ضامن ہوگا۔" اس کے بعد فرماتے ہیں: " دليلنا اجماع الفرقة و أخبارهم اس حکم کے سلسلہ میں ہماری دلیل تمام شیعہ علماء کا اجماع اور ان کی حدیثیں ہیں۔"[۱]

اس عبارت سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ جیل میں صفائی اور قیدیوں کی حفاظت کا پورا انتظام ہونا چاہئے اگر گندگی یا حفاظتی بندوبست میں کسی کمی کے باعث حادثہ رونما ہوتا ہے تو جیل کا منتظم مقتولوں کے خون کا ذمہ دار ہوگا۔

۳) شیخ طوسی ہی نے اپنی ایک دوسری کتاب "مبسوط" میں بعض فقہاء سے نقل فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو کسی کمرہ میں قید کر کے اس کا دروازہ بند کردے اور وہ قیدی آکسیجن کی کمی کے باعث مر جائے تو قید کرنے والا اس کی دیت (خوں بہا) کا ذمہ دار ہوگا۔[۲]

یہی بات بھوک وغیرہ کے سلسلہ میں کہی گئی ہے۔

ان تمام احکام سے یہی پتہ چلتا ہے کہ جیل میں قیدیوں کے لئے کھانے پینے صفائی اور ہوا وغیرہ کا معقول بندوبست ہونا چاہئے تا کہ قیدی کی زندگی اور صحت کو کسی قسم کا خطرہ لاحق نہ ہو۔

۴) بہت سے فقہانے آداب قاضی کی بحث میں تحریر فرمایا ہے کہ جس وقت کوئی قاضی کسی شہر میں داخل ہوتا ہے تو اس کا یہ فرض ہے کہ پورے شہر میں اعلان کروادے کہ قاضی فلاں دن قیدیوں کے مسائل کا جائزہ لے گا اور ان کی شکایت سنے گا لہٰذا جس کا کوئی قیدی ہے اس دن حاضر ہوکر اپنے مسائل قاضی کے سامنے پیش کرے۔ جب سب لوگ اکٹھا ہوجائیں تو ایک ایک قیدی کا نام پکارا جائے اور قاضی ان کے قید ہونے کی وجہ دریافت کرے اور پھر مدعیوں سے سوال کرے اگر قیدیوں کو جیل میں رکھنے کے سلسلہ میں اطمینان بخش دلیل موجود ہو تو قیدیوں کو دوبارہ جیل میں بند کردے اور اگر کوئی مدعی موجود نہ ہو تو اس قیدی کا نام آشکارا اعلان کرے تا اگر کوئی شاکی و مدعی ہے تو قاضی کے

۱) کتاب خلاف، جلد ۳، ص ۹۶
۲) احکام زندان در اسلام، ص ۲۶۳

سامنے حاضر ہو کر اپنا دعویٰ پیش کرے اگر اس کے بعد بھی کوئی دعویٰ پیش نہیں کرتا تو اسے آزاد کر دے[1]

بہت سے فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ شہر میں داخل ہوتے ہی قاضی کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ وہ قیدیوں کے حالات اور ان کی فائلوں کا جائزہ لے اگر کسی کی قید کی مدت ختم ہو چکی ہے یا بلا وجہ اسے قید میں رکھا گیا ہے تو اسے فوراً آزاد کر دے۔

قیدیوں کی حمایت کے لئے ابو یوسف کا منصوبہ

تاریخ اسلام میں، عباسی دور حکومت میں سب سے زیادہ گھٹن تھی اس کی ایک بہترین دلیل اس دور میں قید خانوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ قیدیوں پر تشدد، بے گناہ افراد کی گرفتاری اور قرون وسطیٰ کے ٹارچر کا وجود ہے۔

اس دور میں زبردست سنسر کے باوجود جب جیل کی کال کوٹھریوں کے مظالم کی دہشتناک خبریں چھن چھن کر باہر پہنچیں ہیں اور عوام کے اعتراض کی آوازیں بلند ہونے لگیں خصوصاً جب علماء نے بھی جیل کے حالات میں بہتری لانے کے لئے دباؤ ڈالنا شروع کیا تو اس وقت جو مثبت کام انجام پایا اس میں سے ایک، اہل سنت کے معروف فقیہ اور ابو حنیفہ کے مشہور شاگرد ابو یوسف کا منصوبہ ہے۔

ہارون رشید نے عوام کو چپ کرانے کے لئے ابو یوسف کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ اسلام اور اسلامی قوانین کی روشنی میں قیدیوں سے برتاؤ کا ایک لائحہ عمل تیار کریں۔ ھارون نے یہ قید لگا دی تھی کہ صرف اس سوال کا جواب دیا جائے کہ جب شرپسند، چور اور مجرمین گرفتار کیے جاتے ہیں تو کیا ان کے کھانے پینے کا بندوبست کرنا بھی جیل کے ذمہ داروں کے فرائض میں شامل ہے؟ اور اگر یہ ان کے فرائض میں شامل ہے تو اس کے لئے رقم کہاں سے آئے گی زکوۃ سے حاصل کی جائے گی یا کسی اور سے؟ مجموعی طور پر قیدیوں سے کیسا سلوک کرنا چاہیے؟

ظاہر ہے کہ ھارون کو قیدیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ رائے عامہ کے دباؤ سے مجبور ہو کر اس نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ ابو یوسف نے اس سلسلہ میں ایک تفصیلی لائحہ عمل ترتیب دے کر خلیفہ کے پاس بھیج دیا اور شجاعانہ صراحت کے ساتھ جیل کی موجودہ صورت حال پر تنقید کرتے ہوئے

[1] بدائع الصنائع، جلد ۷، ص ۱۶

اسلامی احکام وقوانین پیش کردیے انھوں نے اپنا لائحہ عمل صرف شر پسندی وچوری وغیرہ جیسے الزام میں قید، قیدیوں تک محدود نہیں رکھا کیونکہ وہ اچھی طرح سے جانتے تھے کے عباسیوں کی کال کوٹھریوں میں زیادہ تر قیدی، سماجی وسیاسی قیدی ہیں۔

اس تاریخی منصوبہ کو ۱۲ حصوں میں خلاصہ کر کے یہاں پیش کرر ہے ہیں:

۱) اگر قیدیوں کے پاس پیسہ موجود نہ ہو توان کے کھانے پینے کا انتظام زکات (حق فقراء) سے یا بیت المال (عام مسلمانوں کے حق) سے کیا جائے۔

۲) ہر قیدی کے لئے بہ قدر ضرورت غذا تیار کی جائے اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی جائز نہیں ہے۔

۳) خاص خیال رکھا جائے کہ اگر مشرکوں میں سے کسی کو بھی گرفتار کیا جاتا ہے تو جب تک اسلامی عدالت اس کے بارے میں اپنا فیصلہ نہیں سنا دیتی اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے اور اس کے کھانے پینے کا بندوبست کیا جائے۔ پھر مسلمان قیدی کو کیسے محروم رکھا جاسکتا ہے کیا اسے بھوکا مرنے دیا جاسکتا ہے؟!

۴) اے خلیفہ! گذشتہ خلفاء ہمیشہ قیدیوں کی سفارش کیا کرتے تھے ان کے لئے کھانے پینے اور سردی گرمی کے لائق کپڑوں کا انتظام کرتے تھے۔ سب سے پہلے یہ قدم امیرالمومنین علی نے اٹھایا ہے۔ بعد کے خلفاء بھی اسے اہمیت دیتے رہے ہیں۔

بعض راویوں نے مجھے بتایا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے تاکیدی فرمان جاری کیا تھا کہ کسی قیدی کو اس طرح سے زنجیروں میں نہ جکڑا جائے کہ وہ کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکے جن لوگوں نے کسی بے گناہ کا خون بہایا ہے ان کے سوا کسی کو رات بھر غل وزنجیر میں نہ جکڑا جائے۔

۵) تاکید کر دیجیے کہ قیدیوں کو کھانے کے لئے نقد پیسے کی شکل میں ہر مہینہ کے شروع میں خود قیدیوں کے سپرد کر دیا جائے کیونکہ اگر غذا جنس کی شکل میں قیدیوں کو دی جائے گی تو مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ جیل کے کارندے اسے چرالے جائیں گے۔ اور کوئی خاص چیز قیدی کے ہاتھ

نہیں آئے گی (ابو یوسف نے یہاں عباسی جیلوں میں پائی جانے والی بدعنوانی کو اجاگر کیا ہے)

۶) کسی مطمئن اور نیک شخص کو یہ ذمہ داری سونپئے کہ وہ ایسے تمام قیدیوں کا نام ایک رجسٹر میں درج کرلے جن کے کھانے پینے کا بندوبست بیت المال سے کیا جاتا ہے۔ اس رجسٹر کو اپنے پاس رکھئے اور ہر مہینہ کی ابتدا میں قید خانہ میں خود جا کر رجسٹر میں لکھے نام کے مطابق ایک ایک قیدی کو بلا کر ان کا خرچ اپنے ہاتھوں سے ان کے سپرد کیجئے۔ میرے خیال میں ہر شخص کے لئے دس دینار ماہانہ کافی ہوگا (یہ دھیان میں رکھتے ہوئے کہ دینار سونے کا ہوتا تھا۔ یہ رقم اچھی خاصی ہے اور قیدیوں کی تمام ضرورتیں پوری ہوسکتی ہیں)

۷) میں نے سنا ہے کہ بعض قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑ کر عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں تاکہ عوام ترس کھا کر کچھ صدقہ ان قیدیوں کو دیدیں۔ وہ اس طرح سے قیدیوں کے لئے پیسا اکٹھا کرتے ہیں! اس ناشائستہ عمل پر پابندی لگایئے کیونکہ خدا اس سے راضی نہیں ہے، میں نہیں سمجھتا کہ مشرکین بھی مسلمان اسیروں کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے ہوں گے۔ پھر مسلمان قیدیوں کے ساتھ ایسا سلوک کیسے کیا جاسکتا ہے؟ اور پھر یہ بھی نہیں معلوم کہ صدقہ کے ذریعہ جو پیسا اکٹھا ہوتا ہے وہ قیدیوں کو ملتا بھی ہے یا نہیں!!

۸) اگر کوئی لاوارث شخص جیل میں مرجائے تو اس کے غسل وکفن وغیرہ کا مناسب انتظام بیت المال سے کیا جائے۔ اور اس پر ایک مسلمان کے عنوان سے نماز پڑھ کر اسے دفن کیا جائے۔

مجھے معتبر ذرائع سے یہ خبر ملی ہے کہ جب جیل میں کسی پردیسی قیدی کا انتقال ہوجاتا ہے اس کا جنازہ ایک دو دن تک یوں ہی زمین پر پڑا رہتا ہے یہاں تک کہ جیل میں موجود قیدی جیل کے ذمہ داروں سے ضروری احکام حاصل کرلیں۔ اس اثنا میں اس غم انگیز منظر کے خاتمہ کے لئے قیدی خود آپس میں چندہ کرکے کسی شخص کے سپرد کرتے ہیں تاکہ وہ اس جنازہ کو صرف قبرستان تک پہنچا دے پھر وہاں غسل وکفن دیئے بغیر اسے یوں ہی زمین میں گاڑ دیتے ہیں۔ یہ بڑا دردناک منظر ہے جسے کوئی مسلمان برداشت نہیں کرسکتا!

۹) میرا خیال ہے کہ اگر اسلامی حدود و تعزیرات کو صحیح طریقہ سے جاری کیا جائے تو قیدیوں کی تعداد کافی کم ہو جائے گی کیونکہ جب مجرمین، جرم کی سزا اوس کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے تو ان کے دل پر اثر ہوگا!

قیدیوں کی تعداد میں اضافہ کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ بہت سے قیدیوں کو جیل میں ڈالنے کے بعد بھلا دیا جاتا ہے ان کے بارے میں چھان بین بند کردی جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کو یہ ذمہ داری سونپئے کہ وہ ہر روز قیدیوں کی فائل کا مطالعہ کر کے ان کے معاملات جلد از جلد نمٹائیں اگر ان کے خلاف کوئی ثبوت موجود ہے تو انھیں سزا دے کر آزاد کر دیا جائے اگر بے گناہ ہیں تو انھیں جیل سے چھٹکارا دلایا جائے۔

۱۰) تاکیدی حکم صادر فرمائیے کہ مجرموں کو سزا دینے میں افراط نہ کیا جائے۔ اسلامی سزاؤں سے قدم آگے نہ بڑھائیں۔ مجھے یہ خبر ملی ہے کہ آپ کے کارندے صرف الزام کی صورت میں قیدیوں کو مارتے ہیں۔ حتی بعض ملزموں کو دو یا تین سو کوڑے مارے گئے ہیں!

اسلام میں یہ جائز نہیں ہے۔ مسلمان کا جسم بھی محترم ہے اسے بلا سبب نہیں مارا جا سکتا۔

۱۱) اگر کسی قیدی نے کوئی ایسا جرم کیا ہے جس کے بدلہ میں اس سے قصاص لینا چاہئے یا کوئی ایسا گناہ کیا ہے جو حد یا تعزیر کا باعث ہے تو اس کے حق میں اسلامی احکام کو نافذ کرنا چاہئے۔ اسے خواہ مخواہ جیل میں نہیں سڑانا چاہئے۔ اگر قصاص کے سلسلہ میں، صاحبان قصاص، مجرم کو معاف کردیں تو اسے فوراً آزاد کر دینا چاہئے۔

۱۲) جہاں قصاص ممکن نہیں ہے وہاں قاتل کو پوری دیت ادا کرنی چاہئے دیت ادا کرنے کے بعد آثار ندامت و توبہ ظاہر ہونے تک اسے قید میں رکھنا چاہئے لیکن اس کے فوراً بعد اسے آزاد کر دینا چاہئے۔

یہ تاریخی خط جس سے قیدیوں کے متعلق اسلامی قوانین کے بارے میں عباسی دور کے ایک فقیہ کے نظریہ کا پتہ چلتا ہے اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات کا ایک زندہ نمونہ ہے۔ ❁

(۱) الخراج ص ۱۰۶-۱۰۷ تلخیص کے ساتھ

تاریخ تدوین قرآن

جناب حسین جواں آراستہ

علوم قرآن کی ایک نہایت اہم بحث، تاریخ تدوین قرآن کے بارہ میں تحقیق و جستجو ہے۔ ہر مسلمان، اپنی دینی کتاب کی تاریخ سے آشنا ہونے کا خواہشمند ہے۔ تاریخی دستاویزوں اور موجودہ مصادر و مآخذ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صدر اسلام کے مسلمان اور آنحضرتؐ کے اصحاب اس مقدس کتاب کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔ مسلمانوں کے لیے یہ جانکاری بہت اہم ہے کہ یہ قرآن جو آج ان کے ہاتھوں میں کسی قسم کی تحریف اور الٹ پھیر کے بغیر اپنی اصل شکل میں موجود ہے کتنے نشیب و فراز سے گزرا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے نزول وحی کا اتنا شاندار استقبال کیا کہ دیکھنے اور سننے والے مبہوت و حیرت زدہ رہ گئے۔ مسلمانوں نے قرآن مجید کی کتابت اور حفظ پر اپنی ساری توانائی صرف کر دی اور اتنے شوق و ولولہ کے ساتھ اس میدان میں اترے کہ قلم اسے بیان کرنے سے قاصر ہے۔

حفظ قرآن کا مرحلہ

ابتداء میں پیغمبر اسلامؐ اور آپ کے اصحاب باوفا نے اپنے سینوں اور اپنے حافظہ میں قرآن کو محفوظ کرنا شروع کیا۔ عرب قوم اس خداداد نعمت یا مضبوط حافظے سے مالا مال

حضرت علیؑ کی نصیحت

موت کو یاد رکھو

میں تمھیں وصیت کرتا ہوں کہ موت کو یاد رکھو اور اس سے غفلت نہ برتو۔ آخر اس سے کیسے غفلت کر رہے ہو جو تم سے غفلت کرنے والی نہیں ہے اور اس فرشتۂ موت سے کیسے امید لگائے ہو جو ہرگز مہلت دینے والا نہیں ہے۔ تمھاری نصیحت کے لئے وہ مردے ہی کافی ہیں جنھیں تم دیکھ چکے ہو کہ کس طرح اپنی قبروں کی طرف بغیر سواری کے لیجائے گئے اور کس طرح قبر میں اتار دئے گئے کہ خود سے اُترنے کے بھی قابل نہیں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کبھی اس دنیا کو بسایا ہی نہیں تھا اور گویا کہ آخرت ہی ان کا ابدی مکان ہے۔ وہ جہاں آباد تھے اسے وحشت کدہ بنا گئے اور جس سے وحشت کھاتے تھے وہاں جا کر آباد ہو گئے۔ یہ اسی میں مشغول رہے تھے جس کو چھوڑنا پڑا اور اسے برباد کرتے رہے تھے جدھر جانا پڑا۔ اب نہ کسی برائی سے بچ کر کہیں جاسکتے ہیں اور نہ کسی نیکی میں کوئی اضافہ کرسکتے ہیں۔ دنیا سے اُنس پیدا کیا تو اس نے دھوکہ دے دیا اور اس پر اعتبار کرلیا تو اس نے تباہ و برباد کردیا۔

(خطبہ نمبر/۱۸۸)

اسلامی نظام سیاست میں انسان اور آزادی

اسلام کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ سیاست وحکومت، اس دین کی تعلیمات کا اہم جزء ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار صاحب بصیرت محقق کے لئے ممکن نہیں ہے۔ اس مقام پر ایک سوال یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ سیاسی وسماجی امور میں دین کس قدر مداخلت کر سکتا ہے؟ اور سیاسی وسماجی میدانوں میں انسان کو کس حد تک اپنے قوانین کا پابند بنا سکتا ہے؟ اسلامی تعلیمات کے نقطۂ نظر سے انسان کس قدر آزاد ہے؟ اور کیا دینی بندشیں انسان کی آزادی سے متصادم نہیں ہیں؟ ان سوالوں کے جواب کے لئے مفہوم آزادی کی وضاحت اور اسلام میں اس کے حدود پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

مفہوم آزادی

آزادی، انسانی اقدار میں ایک اہم اور حقیقی قدر مانی جاتی ہے۔ اسی لئے سبھی اس کا کلمہ پڑھتے ہیں انسان اپنی فطرت کے مطابق غلامی سے نجات اور آزادی کے حصول کے لئے کوشاں رہتا ہے۔

آزادی کی کوئی واضح ومشخص تعریف موجود نہیں ہے اور یہی چیز لوگوں کے خیالات میں اختلاف اور اس کے حدود نیز دین سے اس کے تعلق کے سلسلہ میں غلط فہمی کا باعث بنی ہے اس لئے سب سے پہلے اس کے مختلف معانی کا اجمالی جائزہ لینا ضروری ہے۔

(الف) تکوینی وفلسفی آزادی

جب آزادی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو کبھی اس سے مراد تکوینی آزادی ہوتی ہے جو نظریہ جبر

کے مد مقابل ہے۔ زمانہ قدیم ہی سے یہ بحث ہوتی رہی ہے کہ انسان مجبور ہے یا آزاد و مختار۔ علماء و دانشور، اس مسئلہ میں دو حصوں میں بٹے نظر آتے ہیں ۔ کچھ کا خیال ہے کہ انسان، مجبور محض ہے اس کا اپنے اوپر کوئی اختیار نہیں وہ اپنی مرضی و ارادہ سے کچھ نہیں کرتا یہ لوگوں کا وہم ہے کہ انسان اپنے اعمال، اپنی مرضی و ارادہ سے انجام دیتا ہے۔

تاریخ کے تقریباً ہر دور میں نظریہ جبر کے قائل افراد موجود رہے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اسلامی فرقے اس مکتب فکر کے حامی نظر آتے ہیں۔ اہل سنت کا ایک اہم کلامی فرقہ "اشاعرہ" اسی طرز فکر کا حامی ہے۔ لیکن مسلمانوں کی اکثریت جس میں شیعہ بھی شامل ہیں اس نظریہ کے قائل نہیں ہیں کیونکہ ہر انسان، میدان عمل میں خود کو آزاد و مختار محسوس کرتا ہے اگر انسان مجبور محض ہوتا تو پھر اخلاقی، تربیتی نظاموں اور حکومتی مشینری کے لئے کوئی گنجائش ہی نہ ہوتی۔ اگر انسان اپنے اچھے یا برے عمل میں مجبور ہوتا تو پھر اچھے کام کے لئے اس کی تعریف اور برے کاموں کے لئے اس کی مذمت نہ کی جاتی۔ اگر بچہ اپنے تمام افعال و اعمال میں مجبور ہے تو پھر تعلیم و تربیت، کس لئے؟ اس کی کیا ضرورت ہے۔؟! سیاسی، اقتصادی اور حقوقی شعبوں میں اصول و قوانین کی موجودگی بہترین دلیل ہے کہ انسان آزاد ہے۔ یہ تکوینی آزادی ہے جو خدا نے اسے عطا کی ہے اور یہی آزادی دوسری مخلوقات پر اس کی فضیلت و برتری کا سبب ہے۔

تمام موجودات میں یہ صرف انسان ہے جو مختلف و متضاد رجحانات کا حامل ہونے کے باوجود انتخاب و اختیار کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ نعمت عطا کی ہے تا کہ وہ اپنے آزاد ارادہ سے راہ حق یا باطل کو چنے اگر وہ اپنی اس آزادی کا صحیح استعمال کر کے اپنی حیوانی خواہشات کو نظر انداز کرے تو وہ رشد و کمال کی معراج میں اس حد تک پہنچ جائے گا کہ فرشتے بھی اس سے پیچھے نظر آئیں۔ قرآن کی سینکڑوں آیتیں ۔۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پورا قرآن تکوینی طور پر انسان کے آزاد و مختار ہونے کا اعلان کر رہا ہے۔ کیونکہ قرآن انسان کی ہدایت کے لئے آیا ہے اگر انسان مجبور ہوتا تو اس کی ہدایت بھی جبری ہوتی، اس کی اختیاری ہدایت کی

گنجائش نہ ہوتی ایسی صورت میں قرآن بے اثر اور بے فائدہ ہوتا۔ قرآن مجید، انسان کے آزاد و مختار ہونے کا اعلان واضح لفظوں میں کر رہا ہے:

و قل الحق من ربکم فمن شاء فلیؤمن و من شاء فلیکفر (کھف / ۲۹)

کہہ دیجئے یہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر ہو جائے

انا ھدیناہ السبیل اما شاکراً و اما کفوراً (انسان / ۳)

اسلام کے سیاسی نظام میں، تکوینی آزادی ایک مسلمہ حقیقت ہے جو سیاسی مسائل کے تجزیہ میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ کیونکہ اگر انسان کو کسی طرح بھی مجبور فرض کریں تو پھر وہ اپنے اعمال میں بے اختیار ہوگا۔ سماجی تبدیلیوں کے رحم و کرم پر ہوگا اس سے ذمہ داری کا احساس چھن جائے گا۔

انسان کا آزاد و مختار ہونا اللہ کو ایک ماننے اور تمام اعمال کا سرچشمہ اسی کی ذات کو تسلیم کرنے سے منافات نہیں رکھتا کیونکہ انسان کی فاعلیت، الٰہی فاعلیت کے طول میں ہے، اس سے معارض نہیں ہے۔

سیاسی نظام میں آزادی سے ہماری مراد تکوینی آزادی نہیں ہوتی۔ تکوینی آزادی سے گفتگو فلسفہ و کلام میں ہوتی ہے سیاسی نظام کے ذیل میں نہیں۔

(ب) اخلاقی آزادی

اخلاقی آزادی سے مراد، شہوت اور جنسی غرائز کے تسلط سے عقل کی رہائی ہے۔ آزادی کا یہ مفہوم، اخلاقی نظاموں میں موضوع بحث ہوتا ہے۔ سیاسی نظام میں مستقل طور پر اسے مورد توجہ قرار نہیں دیا جاتا کیونکہ اسلام کے سیاسی نظام میں حقوق فرائض کا تعلق انسان کی صرف سماجی زندگی ہے اور حکومت صرف ان ہی فرائض کے نفاذ کی ذمہ دار ہوتی ہے جبکہ اخلاقی آزادی کا تعلق انسان کی فردی زندگی سے ہے اس لئے حقوق و سیاست کی بحث سے اس کا براہ راست ربط نہیں ہے۔

(ج) حقوقی آزادی

اسلام کے سیاسی نظام میں آزادی سے مراد صرف یہی آزادی ہے اور اس سلسلہ میں بحث

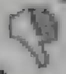
یہ ہے کہ قانون بنانے اور نافذ کروانے والے ذمہ دار ادارے، افراد کی آزادی کو کس قدر محدود کر سکتے ہیں۔ معاشرتی تعلقات و روابط میں کن قوانین کی رعایت کے لئے مجبور کر سکتے ہیں؟

خود" آزادی" آزاد ہے یا مقید؟ یہ اختلاف انگیز بحث ہے۔ مغربی دنیا کے سیاسی مفکرین بھی دو حصوں میں بٹے نظر آتے ہیں۔ بعض دانشوروں نے آزادی کو ہر چیز پر مقدم سمجھا ہے وہ چند استثنائی مقامات کے سوا آزادی کو ہر قسم کی قید و بند سے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں جبکہ مخالف گروہ کا کہنا ہے کہ فرد اور سماج کے لئے مفید نشانہ تک پہنچنے کی خاطر انسان کو زبردستی اس ہدف کی طرف دھکیلنا چاہئے۔ اگر اس مقصد تک رسائی کے لئے انسان سے اس کی آزادی کو چھین لینا یا اس کے دائرہ کو تنگ کرنا ضروری ہو تو اس سے بھی گریز نہیں کرنا چاہئے۔ ان لوگوں کے خیال میں قانون سازی اور اس کے نفاذ کے لئے ایک طاقت ور حکومت کی تشکیل ضروری ہے۔ میکیاولی، ھوبز اور نیٹشے کا شمار ان ہی لوگوں میں ہوتا ہے جو ڈکٹیٹر حکومت کے حامی ہیں۔ مغربی مفکرین کے اس اختلاف کا سبب، خود انسان کے بارے ان کا نظریہ ہے۔ ہر مفکر، انسان سے متعلق اپنے نظریہ کے مطابق آزادی کو پابند یا آزاد کرنا چاہتا ہے۔ آزادی کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان اختلاف کا سبب یہ نہیں ہے کہ انھیں نہیں معلوم کہ آزادی بہتر ہے یا استبداد بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ کچھ لوگ انسان کے متعلق حسن ظن رکھتے ہیں اور کچھ سوء ظن۔

دین اور آزادی میں ٹکراؤ:

(الف) دین کے پرتو میں آزادی کا مفہوم: آزادی کے سلسلہ میں ایک سوال یہ ہے کہ دین و آزادی کے درمیان کیا رابطہ ہے؟ دین آزادی پر مقدم ہے یا آزادی دین پر مقدم؟ کیا آزادی اصل ہے اور دین اس کے تابع ہے یا برعکس، دین اصل ہے آزادی اس کے تابع ہے؟

اجمالی نظر میں یہ ایک علمی سوال ہے لیکن مقام بحث میں اگر یہ کہا جائے کہ دین اصل ہے تو فوراً کہیں گے جب تک انسان آزاد نہ ہوگا وہ کیسے کسی دین کو انتخاب کر سکتا ہے اس طرح وہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ آزادی، دین پر مقدم ہے لہذا دین، آزادی کو محدود نہیں کر سکتا پس آزادی



اصل ہے اور انسان جو چاہے کر سکتا ہے۔

بظاہر یہ استدلال بہت اچھا نظر آتا ہے۔ لیکن در حقیقت یہ ایک مغالطہ ہے۔ دین کو قبول کرنے کا لازمہ آزادی بتایا گیا ہے اور اسے دین پر مقدم رکھا گیا ہے اور نتیجہ نکالا گیا ہے کہ دین اپنی جنم داتا آزادی کو نابود نہیں کر سکتا۔

اسی سے مشابہ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ انسان آزاد پیدا کیا گیا ہے وہ غلام نہیں ہے لہذا اسے اپنی زندگی میں بھی آزاد رہنا چاہئے۔ کبھی کہتے ہیں ارادہ، اختیار اور آزادی ایک قدر ہے تکوینی آزادی کا لازمہ تشریعی آزادی ہے۔

ہمارا نظریہ ہے کہ آزادی، دین اور اسلام سے مافوق نہیں ہے اگر آزادی دین پر مقدم ہوتی تو پھر دین کا نزول اور قانون وحکومت کی برقراری بے معنی ولغو ہوتی قانون کا تو مطلب ہی آزادی کی بندش ہے دین میں بھی سیاسی وسماجی قوانین شامل ہیں جو انسان کے معاشرتی افعال و اعمال کو سمت دیتے ہیں اور اسے ایک خاص دائرہ میں محدود کرتے ہیں۔ اگر دین اس لئے آیا ہے کہ جو شخص جس طرح سے زندگی بسر کرنا چاہتا ہے بسر کرے تو پھر دین کی حیثیت ہی کیا رہ گئی؟ ہاں اگر کوئی شخص یا کچھ افراد دین کے نام پر لوگوں کی جائز آزادی کو چھیننا چاہیں اور خدا نے جس چیز کو حلال کیا ہے اسے حرام یا اس کے برعکس دین کے نام پر اللہ کے حرام کو حلال کرنا چاہیں تو یہ عمل بدعت اور قابل مذمت ہے۔

انّ اللہ یحب ان یؤخذ برخصتہ کما یحبّ ان یؤخذ بعزائمہ

خدا یہ چاہتا ہے کہ اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام ہی سمجھا جائے

مذکورہ بالا گفتگو سے یہ بات واضح ہوگئی کہ آزادی یا جائز ہے یا ناجائز۔ دین وقانون جسے جائز قرار دیں وہ جائز ہے اور جسے ناجائز قرار دیں وہ ناجائز ہے اب یہ کہنا بے معنی ہے کہ دین وقانون، آزادی کو محدود کرتے ہیں، اگر آزادی، ناجائز ہو اور دین نے اس کی ممانعت کی ہو تو پھر یہ بے معنی سی بات ہوگی کہ دین کو ناجائز آزادی کی ممانعت کا حق نہیں ہے کیونکہ یہ ایک خاص

قسم کا تناقض ہے۔
مذکورہ گفتگو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آزادی، خداداد نعمت ہے اور انسان کی مادّی و معنوی ترقی کی ضروری شرط ہے۔ اگر انسان نعمت آزادی سے محروم ہوتا تو وہ علم و آگہی کے ساتھ دین کو انتخاب نہیں کر سکتا تھا اور ایسی صورت میں اس کے عقیدہ کی کوئی قیمت نہ ہوتی۔ انسانی کمال اس کے شعوری انتخاب میں نہاں ہے۔ لا اکراہ فی الدین کا بھی یہی مطلب ہے۔ البتہ نعمت آزادی سے استفادہ کی ایک حد ہے اس حد سے آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔

و من یتعد حدود اللہ فاولئک ھم الظالمون ۔

اللہ کی معین کی ہوئی حدود سے گزرنے والے ہی ظالم ہیں (بقرہ/۲۲۹)

الٰہی حدود سے تجاوز، شقاوت، بدبختی اور الٰہی نعمتوں سے محرومیت کا باعث ہے۔ جس طرح سے کھانے پینے اور جنسی خواہشات کی تسکین میں افراط، ہلاکت کا سبب ہے۔ بشری فطرت کو بہانہ بنا کر آزادی کے حدود سے تجاوز بھی اس نعمت کے زوال کا سبب ہے۔

(ب) دینی حکومت اور آزادی میں ٹکراؤ: دینی حکومت کو سماج سے دور رکھنے کی غرض سے ایک شبہ جو ایجاد کیا گیا ہے در حقیقت وہ ایک مغالطہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ ہے کہ انسان ایک آزاد، خود مختار مخلوق ہے لہذا جو چاہے کر سکتا ہے۔ اگر دین، انسان کے سیاسی و سماجی امور میں مداخلت کرتا ہے اور لوگوں کو کسی خاص طرز عمل کو اپنانے پر مجبور کرتا ہے تو یہ انسان کی آزادی کے خلاف ہے۔ کسی کو کسی کام پر مجبور نہیں کرنا چاہئے، دین کی طرف سے فرائض و واجبات کا تعین اور اطاعت مطلق کا فرمان، انسان کی آزادی سے میل نہیں کھاتا۔

اس نظریہ کے طرفداروں نے جو خود کو دین دار بھی کہتے ہیں اپنا مدعیٰ ثابت کرنے کے لئے کچھ آیتوں اور روایتوں کا بھی سہارا لیا ہے اور ان آیتوں، روایتوں سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اسلامی حکمراں کی اطاعت، انسان کی آزادی کے خلاف ہے جن آیتوں کا ان لوگوں نے سہارا لیا ہے وہ یہ ہیں:

فذکّر انّما انت مذکّر لست علیھم بمسیطر (غاشیہ / ۲۲)

آپ لوگوں کو یاد دلائیں کیونکہ آپ کا کام صرف یاد دلانا ہے آپ ان پر مسلط نہیں ہیں۔

اس آیت کے مطابق پیغمبر کو بھی جو سب سے اعلیٰ مقام و منصب کے حامل ہیں عوام پر تسلط حاصل نہیں ہے۔ عوام آزاد تھے اور وہ پیغمبر کی اطاعت کرنے پر مجبور نہیں تھے۔

وما جعلناک علیھم حفیظا وما انت علیھم بوکیل (انعام / ۱۰۷)

اور ہم نے، نہ آپ کو ان کا نگہبان بنایا ہے اور نہ آپ ان کے اعمال کے ذمہ دار ہیں۔

وما علی الرسول الاّ البلاغ (مائدۃ / ۵)

رسول کی ذمہ داری صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔

انّا ھدیناہ السبیل امّا شاکرا و امّا کفورا (انسان / ۷۶)

ہم نے انسان کو راستہ دکھا دیا ہے اب یہ اس کی مرضی ہے چاہے وہ شکر گزار بنے یا ناشکرا

وقل الحق من ربکم فمن شاء فلیؤمن و من شاء فلیکفر (کھف / ۲۸)

اور کہہ دیجئے کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے پس جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کر لے۔

مذکورہ بالا دعووں کے سلسلہ میں چند نکتے قابل غور ہیں۔

(۱) اس مغالطہ کی زادگاہ مغرب ہے اور یہ ان لوگوں کے ذہن کی اپج ہے جو آیات و روایات کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرنے کے بجائے انھیں اپنے افکار و خیالات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ایک اوزار کی طرح استعمال کرنا چاہتے ہیں اور اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے آیتوں کی من مانی اور یک طرفہ تفسیر کرتے ہیں۔

(۲) مذکورہ بالا آیتوں کے مقابلہ میں بہت سی ایسی آیتیں موجود ہیں جو ان آیتوں کے برخلاف، اطاعت رسول کا حکم دیتی ہیں، چند آیتیں ملاحظہ ہوں:

وما کان لمؤمن ولا مؤمنۃ اذا قضیٰ اللہ و رسولہ امراً ان تکون لھم

الخیرة من امرهم (احزاب / ۳۶)

کسی بھی مومن مرد و عورت کو خدا اور رسول کے حکم کے بعد کوئی اختیار نہیں ہے۔

یہ آیت واضح لفظوں میں بتا رہی ہے کہ خدا اور اس کے رسول کے ہر حکم کی اطاعت ضروری ہے اور کسی مومن کو ان کے احکام سے سرتابی کا حق نہیں ہے۔

انما ولیکم اللہ و رسوله و الذین آمنوا الذین یقیمون الصلاة و یؤتون الزکوٰة و هم راکعون (مائدہ / ۵۵)

تمہارے سرپرست و ولی صرف خدا، اس کے رسول اور مومنین ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور رکوع کی حالت میں زکوٰت دیتے ہیں۔

النبی اولی بالمؤمنین من انفسهم (احزاب / ٦)

نبی کو مومنین کے نفسوں پر خود ان سے زیادہ حق حاصل ہے۔

یہ تمام آیتیں، واضح طور پر یہ بتاتی ہیں کہ پیغمبر، لوگوں کے سلسلہ میں فیصلہ کر سکتے ہیں اور آپ کے احکام کی اطاعت سب پر واجب ہے اور کسی کو سرمو انحراف کی اجازت نہیں ہے۔

پہلی قسم کی آیتوں کا سہارا لینے والے دینی حکومت کے منکروں سے یہ امید نہیں ہے کہ وہ ان دونوں قسم کی آیتوں کے ظاہری تناقض کا جواب دیں گے۔ وہ یا تو سرے سے دوسری قسم کی آیتوں کے مفہوم کو قبول ہی نہیں کرتے اور یا اس سے غافل ہیں لیکن چونکہ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن میں کسی قسم کا تناقض، تضاد یا ناھماہنگی موجود نہیں ہے لہذا ہم پر اس ظاہری تناقض کو برطرف کرنے کی کوشش کرنا فرض ہے۔ اس مقصد کے لئے دونوں قسم کی آیتوں کے سیاق و سباق اور ان کے مخاطبین کا جائزہ لینا ضروری ہے تا کہ آیتوں کا صحیح مفہوم و معنی اجاگر ہو سکے۔

ان دونوں قسم کی آیتوں پر غور و خوض کرنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ دونوں قسم کی آیتوں کا موضوع ایک نہیں ہے دونوں جداگانہ موضوع پر گفتگو کر رہی ہیں پہلی قسم کی آیتیں ان لوگوں کے سلسلہ میں ہیں جنھوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا ہے اسی لئے پروردگار انھیں اسلامی حقائق کی

طرف رہنمائی کر رہا ہے اور اپنی اطاعت قبول کرنے کے فوائد گنا رہا ہے۔ اللہ ان آیتوں میں پیغمبر کو جو الٰہی رحمت و عطوفت کا مظہر ہیں اور عوام کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے محزون و مغموم ہیں تسلّی دے رہا ہے۔ دین بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ عوام حق و سعادت کا راستہ پہچان کر اختیار و آزادی کے ساتھ دین کو قبول کریں نہ یہ کہ انھیں زبردستی دین قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔ زور زبردستی کی بنیاد پر قبول کیا گیا دین، انسانی تربیت سے میل نہیں کھاتا۔ اسی لئے ایمان کی بنیاد اس قلبی عقیدہ پر رکھی گئی ہے جو دلیلوں کے ذریعہ حاصل ہونے والی معرفت کے ذریعہ تشکیل ہوا ہو۔ اس روشنی میں خدا اپنے پیغمبر سے کہتا ہے کہ آپ غم نہ کریں آپ تو اپنی ذمہ داری نبھا چکے ہیں۔ آپ کا کام صرف پیغام پہنچانا تھا وہ آپ پہچا چکے ہیں اب اس سے زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے اگر مشرکین ایمان نہیں لاتے۔

دوسری قسم کی آیتوں میں خطاب، ان مومنوں سے ہے جو معرفت و آگاہی کے بعد اسلام قبول کر چکے ہیں۔ اب ان لوگوں کو خدا اور رسول کے حکم کے مقابلہ میں اپنی مرضی سے اپنے امور کے انتخاب کا حق نہیں ہے۔ ان مسلمانوں کے لئے حکم پیغمبر کو قبول کرنا ضروری ہے۔ ایمان لانے سے پہلے انہیں انتخاب کا حق تھا لیکن ایمان لانے کے بعد اب ان تمام احکام پر عمل ضروری ہے انتخاب کی گنجائش نہیں ہے۔ اپنے من پسند احکام پر عمل اور ناپسند احکام کی خلاف ورزی قبول نہیں کی جائے گی۔

و یقولون نؤمن ببعض و نکفر ببعض و یریدون ان یتخذو ا بین ذالک

سبیلا اولئک ھم الکافرون حقا (نساء / ۱۵۱)

اور وہ کہتے ہیں بعض پر ایمان لائیں گے اور بعض کا انکار کریں گے وہ ان دونوں کے

درمیان ایک راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں یہی لوگ حقیقی کافر ہیں۔

بعض قوانین کو تسلیم اور بعض کو ٹھکرا دینے کا مطلب اصل دین کو قبول نہ کرنا ہے کیونکہ اگر دین کو قبول کرنے کا معیار، اللہ کا حکم ہے تو پھر ہمارے عمل کا محور و مرکز الٰہی حکم ہونا چاہئے اور

تھی۔ وہ اگرچہ بہت سی چیزوں سے محروم تھے لیکن ان کے حافظے اور ذہانت کا جواب نہیں تھا۔ وہ لمبے لمبے قصیدے بہت آسانی سے حفظ کر لیتے تھے۔ اپنے حافظے میں شعراء کے دیوان کو جگہ دیتے تھے۔ زمانہ جاہلیت کا عرب جس کلام کو ایک مرتبہ سن لیتا تھا اسے ہمیشہ کے لیے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا تھا۔ ان کی اسی خصوصیت نے انھیں زباں زد خاص و عام بنا دیا تھا۔

قرآن مجید نے شکل و مفہوم دونوں میدانوں میں سحر انگیز بیان کے ذریعہ ایسا حسین ترین پیغام ایسی قوم کے سامنے پیش کیا تھا جو دلوں میں گھر بنا لیتا تھا۔ مکہ میں نازل ہونے والی ابتدائی آیتیں اور سورے مسجّع و مقفّیٰ اور زیادہ تر موزوں ہیں۔ قرآن مجید کی سورتوں اور آیتوں کا آہنگ اتنا جذاب و پرکشش ہے کہ وہ خود سے بے خود ہو جاتے تھے۔

پیغمبر اسلامؐ بھی اپنے اصحاب کو سورے اور آیتیں حفظ کرنے پر آمادہ فرماتے تھے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ شہر مکہ میں نہ لکھنے والوں کی تعداد زیادہ تھی اور نہ لکھنے کا سامان فراہم تھا لہٰذا عرب مسلمانوں نے اپنے حافظہ کی قوت، مقدس ترین راہ میں صرف کی اپنے سینے اور اپنے قلب کو قرآن کی نورانی آیتوں کا مسکن بنا دیا۔

کتابت قرآن کا مرحلہ

رسول خدا کی زندگی میں، کتابت قرآن کی ضرورت بالکل واضح و آشکار ہے۔ کیوں کہ حفاظت قرآن کے لیے حافظوں میں محفوظ قرآن پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا لہٰذا باوجودیکہ نزول قرآن کے زمانہ میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ بعض نے مکہ میں موجود ایسے افراد کی کل تعداد سترہ بتائی ہے۔ لیکن چونکہ پیغمبر کی نظر میں کتابت قرآن کی بہت زیادہ اہمیت تھی لہٰذا آپ نے اسی مختصر سی تعداد میں سے کچھ افراد کو کتابت قرآن کے لیے چن لیا۔ جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی تھی۔ آپ کاتبان وحی کو بلا کر انھیں اس آیت کو لکھنے کا حکم دیتے تھے۔ یہ لوگ "کتاب وحی" کے نام سے مشہور ہیں۔

کاتبان وحی

کاتبان وحی کی تعداد میں بہت اختلاف ہے۔ حافظ بن عساکر (وفات ۵۷۱ھ)

خدا کا حکم یہ ہے کہ اس کے تمام احکام پر بلا استثناء عمل کیا جائے۔ اگر دین کو قبول کرنے کی کسوٹی مصالح و مفاسد ہیں تب بھی خدا ان تمام مصالح و مفاسد سے بخوبی واقف ہے اور اس نے اپنے احکام میں ان کا بھر پور خیال رکھا ہے۔ پھر اس کے صرف بعض احکام کو کیوں قبول کیا جائے؟ مومن تو وہی ہے جو کسی تردد و کشمکش کے بغیر پیغمبر کے ہر فیصلہ کو خندہ پیشانی سے قبول کرتا ہے کیونکہ اسے یہ یقین ہے کہ آنحضرتؐ، اللہ کے رسول ہیں آپ کا حکم، اللہ ہی کا حکم ہے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے۔

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ (نساء / ۱۰۵)

ہم نے یہ کتاب آپ پر حق نازل کی ہے تا کہ آپ خدا کے سکھائے ہوئے احکام کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں۔

اسلام قبول کر کے میدان عمل میں اس کے تمام احکام کو تسلیم نہ کرنے کی مثال ایسی ہی ہے کہ اس ملک میں جہاں ڈیموکریسی کا نظام قائم ہے۔ لوگ الیکشن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں پوری آزادی کے ساتھ اپنے نمائندوں کا انتخاب کریں لیکن جب ان ہی کے نمائندوں کے ذریعہ بنائے ہوئے قوانین پر عمل کی باری آئے تو انکار کر دیں۔ دنیا کا کوئی بھی عقلمند انسان اس طرز عمل کو تسلیم نہیں کر سکتا۔

اسلام نے کبھی بھی کسی شخص کو اسلام قبول کرنے کے لئے مجبور نہیں کیا لیکن جب کسی نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کر لیا تب وہ اسے اپنے تمام احکام پر عمل کے لئے مجبور کرتا ہے۔ اسلام کو قبول کر لینا اور اس کے احکام کو ٹھکرا دینا یہ صریحی تناقض ہے۔

مذکورہ وضاحت سے یہ حقیقت آشکار ہو گئی کہ دونوں قسم کی آیتوں کے درمیان کسی قسم کا تناقض نہیں ہے اور "فرمانبرداری" و "آزادی" کے درمیان ٹکراؤ کی شکل خود بخود حل ہو گئی۔

(ج) دینی فرائض اور انسان کی انسانیت میں ٹکراؤ:

بعض لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ اختیار و آزادی ہی انسان کا امتیازی جوہر ہے اور نا قابل

جس طرح سے اللہ کائنات کو اپنی مرضی سے چلاتا ہے۔

اس کا جواب سمجھنے کے لئے پہلے الٰہی خلافت کا مطلب سمجھنا ہوگا۔ قرآن کریم میں خلیفۃ اللہ کا عنوان سب سے پہلے حضرت آدم کے لئے استعمال ہوا ہے۔ یہ آدم کے تمام فرزندوں کا مقام نہیں ہے کیونکہ قرآن کریم آدم کے کچھ فرزندوں کو شیاطین کے نام سے یاد کرتا ہے۔

و کذالک جعلنا لکلّ نبیّ عدواً شیاطین الانس و الجن (انعام / ۱۱۲)

اور اس طرح سے ہر نبی کے مقابلہ میں انسانوں اور جناتوں سے تعلق رکھنے والے شیاطین قرار دیئے ہیں بنا برایں یہ شیطان صفت انسان ان لوگوں میں شامل نہیں ہیں جن کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم خدا نے دیا تھا۔

خلیفۃ اللہ میں دو خصوصیت پائی جاتی ہے ایک اسماء کا علم" و علّم آدم الاسماء کلّھا "اور دوسرے یہ کہ خلیفہ الٰہی میں زمین میں عدل و انصاف قائم کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ وہ ظالم و ستمگر افراد جو عدل و انصاف سے کوسوں دور ہیں اور ظلم و ستم میں غرق ہیں وہ خلیفہ خدا نہیں ہو سکتے۔ اللہ کا خلیفہ وہی بن سکتا ہے جو اپنی فردی و اجتماعی زندگی میں اوصاف الٰہی کا مظہر ہو۔ انسان نما شیاطین جنھیں اللہ نے جانوروں سے بھی پست تر بتایا ہے ان کا خدا سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

انّ شرّ الدّوابّ عند اللہ الصمّ البکم الذین لا یعقلون (انفال / ۲۲)

(ھ) انسان کے صاحب حق ہونے اور دینی فرائض میں ٹکراؤ:

انسانی تہذیب و تمدن میں تبدیلی اور سماجی نظاموں میں رونما ہونے والے انقلابات کے پیش نظر یہ ماننا پڑے گا کہ انسان کی سماجی زندگی، تاریخ کے اس طویل سفر میں مختلف مراحل سے گزری ہے۔ ایک زمانہ غلامی کا تھا اس دور میں تمدن و ترقی کا لازمہ یہی تھا کہ کمزور انسان دوسروں کے غلام بنے رہیں۔ اس زمانہ کے لحاظ سے انسان اور خدا کا رابطہ بھی عبد و مولی کی شکل میں پیش کیا جاتا تھا کیونکہ اس وقت سماجی زندگی میں یہی رائج تھا کہ کچھ لوگ آقا و مولی کی حیثیت

سے جانے جاتے تھے اور کچھ لوگ عبد و غلام کی حیثیت سے۔ چنانچہ جس طرح کمزور افراد، طاقتوروں کے غلام مانے جاتے تھے، سب لوگ اللہ کے بندے سمجھے جاتے تھے لیکن آج جب کہ غلامی و بردگی کا رواج ختم ہو چکا ہے، اس دور کے معیار کو برقرار نہیں رہنا چاہئے۔

آج انسان خود کو کسی کا غلام نہیں سمجھتا وہ خود کو آزاد اور اللہ کا خلیفہ تصور کرتا ہے خدا کا جانشین، غلامی و بندگی کا احساس نہیں کرتا وہ خدا کے حکم کا منتظر اور اس کی اطاعت کا خواہاں نہیں ہے بلکہ اپنے لئے ایک طرح کی خدائی کا احساس کر رہا ہے گویا خدا کو برطرف کر کے وہ خود اس کی مسند پر بیٹھ گیا ہے آج ماڈرن دور میں انسان، علم و ترقی کے اس درجہ پر فائز ہو گیا ہے کہ اس میں سرداری و آقائی کا احساس بیدار ہو گیا ہے اطاعت، فرمانبرداری اور فرائض پر عمل جو غلامی کے زمانہ کی یادگار ہے قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔

آج انسان صرف اپنا حق حاصل کرنا چاہتا ہے فرائض پر عمل کا زمانہ رخصت ہو چکا ہے۔ مختصر یہ کہ دین کی پیروی واطاعت، چودہ سو سال پہلے کے سماجی نظام سے مناسبت رکھتی ہے جبکہ آج کا سماجی نظام بدل چکا ہے آج فرائض واطاعت کی گفتگو بے معنی ہے آج کا انسان صرف اپنا حق حاصل کرنے کے چکر میں ہے۔

اس اعتراض کا جواب تکوین وتشریع دو الگ الگ زاویوں سے دیا جانا چاہئے ایک واقعیات کے لحاظ سے اور دوسرا تکالیف و فرائض کے لحاظ سے۔

تکوین کے لحاظ سے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ہمیں خدا سے کیا نسبت ہے۔ جو خدا کے قائل نہیں ہیں منکر وجود خدا ہیں ہماری بحث ان سے نہیں ہے، ہمارا روئے سخن، خدا پر ایمان رکھنے والوں سے ہے خدا پر ایمان رکھنے والا کم از کم اتنا تو ضرور مانتا ہے کہ وہ خدا کی مخلوق ہے۔ اسے خدا کے سوا کسی اور نے وجود نہیں بخشا ہے وہ خالقیت میں توحید کا یقیناً قائل ہے۔ خالقیت میں توحید کا تقاضا عبودیت و بندگی ہے۔ یہ مان لینا کہ ہمیں خدا نے پیدا کیا ہے اور ہمارا وجود اسی کا رہین منت ہے، عبودیت و بندگی کا اعتراف ہے۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور خود کو مسلمان تصور

کرتا ہے لیکن خدا کی بندگی کا منکر ہے وہ واضح تناقض کا شکار ہے۔ عظیم انسانوں کا سب سے بڑا افتخار یہی تھا کہ وہ اللہ کے بندہ ہیں۔

سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلا من المسجد الحرام الیٰ المسجد الاقصیٰ (اسراء/۱)

منزہ ہے وہ ذات جو اپنے بندہ کو ایک رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا۔

عبودیت و بندگی کے بلند درجہ ہی کے باعث قرآن کریم نے اس لفظ کو بار بار استعمال کیا ہے اور انسان کے لئے عبودیت کو کمال کے آخری حد قرار دیا گیا ہے:

یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی (فجر/۲۶۔۲۹)

اے نفس مطمئن اپنے پروردگار کی طرف اس حال میں پلٹ آ کہ تو اپنے پروردگار سے راضی اور تیرا پروردگار بھی تجھ سے راضی ہے پس میرے بندوں کی صف میں داخل ہو جا۔

مقام تشریع میں بھی یہ بات صحیح نہیں ہے کہ قانون کی اطاعت اور ذمہ داری قبول کرنا انسان کی آزادی کے خلاف ہے۔ کیونکہ اگر انسان قانون پر عمل نہیں کرے گا تو سماج میں انارکی پھیل جائے گی۔ جبکہ تمدن کا لازمہ، قوانین کی اطاعت اور ذمہ داری کا بوجھ اٹھانا ہے۔ ایک طرف سے تمدن کی خواہش اور دوسری طرف سے ذمہ داری قبول کرنے سے فرار، خلاف عقل ہے۔ تقاضائے عقل ہے کہ انسان ذمہ داریوں سے فرار اختیار کرنے کے بجائے اسے بحسن خوبی نبھائے اگر کسی سماج میں قانون نہ ہوگا تو وہاں تمدن بھی نہ ہوگا۔ اگر ذمہ داری کا احساس نہ ہوگا تو انسانیت بھی نہ ہوگی۔ تکوین کی حد تک تو آزادی قابل قبول ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تشریع کی منزل میں بھی کسی قانون کی پیروی نہ کرے۔

رہی یہ بات کہ آج کا انسان صرف اپنا حق حاصل کرنا چاہتا ہے فرائض کی ادائیگی اور ذمہ داری کا بوجھ نہیں اٹھانا چاہتا تو لا یہ ایک کھوکھلا نعرہ ہے کیونکہ ہر انسان یہ جانتا ہے اور تمام فلاسفہ یہ مانتے ہیں کہ جب بھی کسی انسان کا کسی انسان پر کوئی حق ثابت ہوتا ہے تو دوسرے

انسان پر ایک فرض عاید ہو جاتا ہے ہر حق اپنے ساتھ ایک فرض کو بھی جنم دیتا ہے۔ حق اور فرض کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مومن وغیر مومن دانشور بھی اس حقیقت کے معترف ہیں۔ لہذا قانونی ذمہ داریوں سے فرار ناممکن ہے ہاں یہ ممکن ہے کہ کچھ لوگ الٰہی قوانین اور اللہ کی طرف سے معیّن کردہ فرائض کے منکر ہوں۔ وہ یہ چاہتے ہوں کہ اللہ ان پر کوئی ذمہ داری عائد نہ کرے ورنہ سماجی ذمہ داریوں اور معاشرتی پابندیوں سے کسی کو مفر نہیں ہے اور کوئی صاحب خرد اس کا انکار نہیں کر سکتا کیوں کہ وجود قانون اور اس کی پابندی کے بغیر وحشی اور جنگل راج ہی قائم ہو سکتا ہے تمدن و انسانیت نہیں۔

انبیاء کرام کے مکتب میں تربیت پانے والے افراد، قانون سازی کا حق اللہ کے ہاتھ میں مانتے ہیں اور اسی کے قانون کی اطاعت ضروری سمجھتے ہیں وہ خدا کے مقابلہ میں غیر اللہ کے قانون سے گریز کرتے ہیں کیوں کہ کائنات کا خالق و مالک اللہ ہی ہے انّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون۔

ہم اللہ کی ملکیت ہیں اور ملکیت کا مطلب ہی یہی ہے کہ مالک جس طرح سے چاہے اپنی ملکیت میں تصرف کرے، جسے چاہے اسے کام میں لائے یہ بات قابل تصور نہیں ہے کہ ہم ایک طرف سے مسلمان ہونے کا دعوی کریں اور دوسری طرف سے خود کو بندگی کی قید سے آزاد سمجھیں۔ اسلام، آزادی کا علمبردار ہے لیکن غیر اللہ اور طاغوتوں کی غلامی و بندگی سے آزادی کا نہ کہ اللہ کی اطاعت سے آزادی کا۔ انسان، اگر چہ تکوینی طور پر آزاد پیدا کیا گیا ہے لیکن تشریعی لحاظ سے خدا کے قوانین پر عمل کرنے کا پابند ہے۔ کتاب خلقت میں ہر مخلوق کی پیشانی پر عبدیت کی مہر ثبت کردی گئی ہے اور ہر موجود کا وجود عین عبدیت ہے۔

تسبّح له السمٰوات السبع و الارض و من فیهنّ و ان من شئی الّا یسبّح بحمده و لکن لا تفقهون تسبیحهم (اسراء / ۴۴)

ساتوں آسمان و زمین اور وہ سب جو ان کے اندر ہیں اسی کی تسبیح کرتے ہیں۔ ہر موجود اس کی تسبیح و حمد کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح سمجھ نہیں پاتے۔

انسان پر ایک فرض عاید ہو جاتا ہے ہر حق اپنے ساتھ ایک فرض کو بھی جنم دیتا ہے۔حق اور فرض کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مومن وغیر مومن دانشور بھی اس حقیقت کے معترف ہیں۔لہذا قانونی ذمہ داریوں سے فرار ناممکن ہے ہاں یہ ممکن ہے کہ کچھ لوگ الٰہی قوانین اور اللہ کی طرف سے معین کردہ فرائض کے منکر ہوں۔وہ یہ چاہتے ہوں کہ اللہ ان پر کوئی ذمہ داری عائد نہ کرے ورنہ سماجی ذمہ داریوں اور معاشرتی پابندیوں سے کسی کو مفر نہیں ہے اور کوئی صاحب خرد اس کا انکار نہیں کر سکتا کیوں کہ وجود قانون اور اس کی پابندی کے بغیر وحشی اور جنگل راج ہی قائم ہو سکتا ہے تمدن و انسانیت نہیں۔

انبیاء کرام کے مکتب میں تربیت پانے والے افراد، قانون سازی کا حق اللہ کے ہاتھ میں مانتے ہیں اور اسی کے قانون کی اطاعت ضروری سمجھتے ہیں وہ خدا کے مقابلہ میں غیر اللہ کے قانون سے گریز کرتے ہیں کیوں کہ کائنات کا خالق و مالک اللہ ہی ہے انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

ہم اللہ کی ملکیت ہیں اور ملکیت کا مطلب ہی یہی ہے کہ مالک جس طرح سے چاہے اپنی ملکیت میں تصرف کرے، جسے چاہے اسے کام میں لائے یہ بات قابل تصور نہیں ہے کہ ہم ایک طرف سے مسلمان ہونے کا دعویٰ کریں اور دوسری طرف سے خود کو بندگی کی قید سے آزاد سمجھیں۔اسلام، آزادی کا علمبردار ہے لیکن غیر اللہ اور طاغوتوں کی غلامی و بندگی سے آزادی کا نہ کہ اللہ کی اطاعت سے آزادی کا۔انسان، اگرچہ تکوینی طور پر آزاد پیدا کیا گیا ہے لیکن تشریعی لحاظ سے خدا کے قوانین پر عمل کرنے کا پابند ہے۔کتاب خلقت میں ہر مخلوق کی پیشانی پر عبدیت کی مہر ثبت کر دی گئی ہے اور ہر موجود کا وجود عین عبدیت ہے۔

تسبّح له السموات السبع و الارض و من فیهنّ و ان من شئی الّا یسبّح بحمده و لکن لا تفقهون تسبیحهم (اسراء / ۴۴)

ساتوں آسمان و زمین اور وہ سب جو ان کے اندر ہیں اسی کی تسبیح کرتے ہیں۔ہر موجود اس کی تسبیح و حمد کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح سمجھ نہیں پاتے۔

یہ صحیح ہے کہ انسان عقل سے مالا مال ہے اور اسے آزاد و مختار پیدا کیا گیا ہے۔ خدا نے اسے ہدایت و ضلالت کے راستہ سے آگاہ کر دیا ہے۔ وہ اپنا راستہ چننے میں آزاد ہے۔ اس کے باوجود اسے اپنی خلقت کے مقصد کو سمجھ کر عبدیت کی منزلیں طے کرنی چاہئے۔

(و) سیاسی نظام میں آزادی کی حد: کیا سماج میں بے روک ٹوک، مطلق آزادی ممکن ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کسی حکومت کو انسان کی آزادی کو بیڑی پہنانے اور اس کے معین کردہ قوانین کی مخالفت کرنے والوں کو سزا دینے کا حق نہیں ہے۔ ورنہ لوگ صرف سزاؤں کے خوف سے جرائم سے دور رہیں گے۔ اگر سزا کا تصور نہ ہوگا تو پھر لوگ اپنی مرضی سے اچھے یا برے کام کریں گے۔ پہلی نگاہ میں یہ اعتراض، دنیا کے تمام نظاموں سے متعلق نظر آتا ہے۔ کیوں کہ دنیا کے ہر سیاسی نظام میں مجرموں اور قانون شکنوں کے لئے سزائیں پائی جاتی ہیں۔ اس اعتراض کی بنیاد "آزادی مطلق" کے اصول پر استوار ہے۔ جس کے مطابق انسان پر کسی قسم کی پابندی اور دباؤ نہیں ہونا چاہئے یہ اصول یقیناً غلط اور غیر معقول ہے۔ ہر عقلمند انسان اسے ٹھکراتا ہے۔ دنیا کے کسی بھی انسان کو بے قید و بند آزادی میسر نہیں ہے۔ اسے قوانین کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جس کی رعایت سب کے لئے ضروری ہے اور ان قوانین کو پامال کرنے والے سزا کے مستحق ہیں۔ اصولی طور پر جب قانون اور حکومت کے وجود کو تسلیم کر لیا گیا تو ساتھ ہی ساتھ اس پر عمل کی ضرورت اور مخالفت کے عدم جواز کو بھی تسلیم کر لیا گیا۔

آزادی مطلق کا مطلب تمدن کی نفی اور جنگل راج کو رواج دینا ہے۔ اگر انسان مدنی الطبع ہے تو اسے سماجی نظام کو بھی قبول کر کے لوگوں کے حقوق کی رعایت و پابندی کرنی ہوگی۔ سماج میں ایسے قوانین کی حکمرانی ضروری ہے جو دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے والوں اور قانون شکنوں کو کیفر کردار تک پہنچا سکے اور ان کے نفاذ کی ضمانت فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے آزادی مطلق کے دعوی کا مطلب وجود حکومت کی ضرورت سے انکار ہے۔ اسلام نے بھی آزادی مطلق کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ اسلامی حکومت، الٰہی حاکمیت کے دائرہ میں رہتے ہوئے

اسلامی قوانین اور شرعی حدود کو سماج میں نافذ کرے گی۔ اسلامی حکومت اللہ کے بنائے قوانین نافذ کرتی ہے اور غیر الٰہی حکومتیں انسانوں کے بنائے قوانین کو نافذ کرتی ہیں اور قانون شکنوں کو سزا دیتی ہیں۔ قانون شکنوں کو آزاد کوئی نہیں چھوڑتا۔

تعین اقدار کا باطنی نظام اور آزادی:

ہر انسان کے اندر ایک باطنی قوت پائی جاتی ہے جو انسان کے حرکات و سکنات کے لئے کچھ حدیں معین کرتی ہے اس طاقت کا نام کبھی عقل عملی اور کبھی ضمیر رکھتے ہیں اور اسی عقل عملی یا ضمیر کے حکم کے مطابق تمام انسان کچھ مشترک اقدار اور واجبات و محرمات کے قائل رہے ہیں عقل یا ضمیر، عدل و انصاف، امانت داری و صداقت کو اچھا سمجھتا ہے اور انھیں اپنانے کا حکم دیتا ہے ظلم اور خیانت کو برا سمجھتا ہے اور اس سے دور رہنے کا حکم دیتا ہے۔

انسانی عقل و ضمیر، ان واجبات و محرمات کی تشخیص میں مستقل و آزاد ہے کسی بیرونی محرک کا محتاج نہیں ہے۔ عقل اپنی تشخیص کے مطابق کچھ واجبات و محرمات کو ہمارے سامنے پیش کر کے ہماری تکوینی آزادی کو محدود کرتی ہے۔ ہمیں جھوٹ بولنے، خیانت و ظلم کرنے سے روکتی ہے باوجودیکہ ہمارے اندر جھوٹ بولنے اور ظلم کرنے کی طاقت و توانائی موجود ہے۔ عقل و ضمیر کی اس پابندی کو کوئی شخص، انسان کی آزادی پر حملہ تصور نہیں کرتا جبکہ انسان اپنی عقل و ضمیر کے مطابق فیصلہ کو مان کر اپنی آزادی کو محدود کرتا ہے۔ عقل و ضمیر کے حکم کے ذریعہ آزادی کی محدودیت، مریض کو دیئے گئے ڈاکٹر کے مشوروں کے مانند ہے جو نہ صرف یہ کہ خفگی و ناراضگی کا سبب نہیں بنتے بلکہ اسے انسان کی بھلائی کے لئے نیک مشوروں اور اچھی رہنمائی تصور کیا جاتا ہے۔ در حقیقت، عقل ہمیں راستہ دکھاتی ہے اور ہمیں ایک ایسے کام کی طرف ہدایت کرتی ہے، جس کا نتیجہ ہمارے لئے مفید ہے۔ عقل ہمیں حکم نہیں دیتی۔ اگر اس کے مشوروں کو حکم اور اسے حاکم مان بھی لیں۔ جیسا کہ ہمارے ادبیات میں رائج ہے کہ اگر کوئی ضمیر کے حکم کی مخالفت کرے گا ضمیر اس کی مذمت کرے گا اور اسے سزا دے گا۔ پھر بھی اس کی حاکمیت، انسان کی آزادی سے

منافات نہیں رکھتی اور اس کی آزادی کو نہیں چھینتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل وضمیر کا تعلق خود انسان سے ہے وہ اسی کا ایک حصہ ہے۔ جب ہمارے اپنے اندر سے ہمیں کوئی حکم دیتا ہے تو ہماری آزادی پر آنچ نہیں آتی ہے ہم اپنے ارادہ اور اپنی خواہش سے عقل کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ جب کوئی بیرونی طاقت ہمیں کسی کام پر مجبور کرتی ہے تب ہماری آزادی چھن جاتی ہے۔

مذکورہ بیان سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے کہ دینی احکام اور شرعی اوامر ونواہی سے جن کا سرچشمہ اللہ تعالی کی ذات ہے ہماری آزادی محدود ہوتی ہے یا نہیں۔

احکام وفرامین، اوامر ونواہی کے ساتھ جب تک ضمانت نفاذ نہ ہوگی وہ ضمیر کے احکام کے مانند ہیں، انسان کی آزادی کے چھننے کا سبب نہیں بنتے۔ یعنی اگر دین صرف نماز پڑھنے کا حکم دینے پر اکتفاء کرے نماز نہ پڑھنے والوں کو سزا نہ دے تو اس صورت میں دینی احکام کی حیثیت صرف مشورہ کی ہوگی کیونکہ مشوروں پر عمل کئے جانے کی کوئی بیرونی ضمانت نہیں ہوتی جس طرح سے عقل وضمیر کے احکام پر عمل کی کوئی بیرونی ضمانت نہیں ہوتی۔

لیکن واقعیت یہ ہے کہ دینی احکام صرف مشورہ نہیں ہیں بلکہ عملی فریضہ ہیں جن کی خلاف ورزی نہیں کی جاسکتی۔ خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا بھی دی جائے گی۔ مثال کے طور پر اگر شریعت نماز پڑھنے کا حکم دیتی ہے تو اس کی مخالفت، باعث عذاب بھی ہے بعض برے اعمال کے لئے شریعت نے دنیا میں بھی سزائیں مقرر کی ہیں۔ جب بھی کوئی نبی آتا تھا لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈراتا تھا۔ قرآن مجید بار بار مسلمانوں کو انذار کرتے ہوئے انھیں یاد دلاتا ہے کہ گذشتہ قوموں کے انجام کو دیکھو کہ احکام خدا کی نافرمانی کے نتیجہ میں ان کا کیا انجام ہوا۔ انبیاء اپنی دعوت کے دوران لوگوں کو برابر عذاب الٰہی سے ڈراتے رہے ہیں اور اپنی دعوت کے اس حصہ پر اتنا زور دیتے رہے ہیں کہ ان کا ایک لقب نذیر ومنذر (ڈرانے والا) ہے۔

انا ارسلناک بالحق بشیرا و نذیرا و ان من امۃ الا خلا فیھا نذیر (فاطر / ۲۴)

ہم نے آپ کو برحق، بشارت دینے والا بنا کر بھیجا ہے۔ ماضی میں ہر امت کے پاس ایک نذیر (ڈرانے والا) تھا۔

پس شرعی احکام جو انذار اور دنیوی واخروی سزاؤں کے ہمراہ صادر ہوتے ہیں وہ اخلاقی وعقلانی احکام وفرامین سے جن کا سرچشمہ، عقل وضمیر ہے فرق رکھتے ہیں۔ بنابریں اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ خدا کو اپنے احکام کے ذریعہ ہماری آزادی کو محدود کرنے کا پورا پورا حق ہے وہ عذاب اور سزاؤں کا خوف دلا کر بعض کاموں کے بجالانے یا ترک کرنے کا پابند بنا سکتا ہے۔

تمام مسلمان اس مسئلہ پر متفق ہیں کہ انبیاء کی ایک ذمہ داری، الٰہی احکام، لوگوں تک پہنچانا اور عذاب الٰہی سے سے ڈرانا ہے اب رہی یہ بات کہ خدا کے احکام وفرامین کی حکمت و مصلحت کیا ہے وہ کیوں ہمیں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیتا ہے؟ اسے علم کلام میں بیان کیا جاتا ہے۔ خداوند عالم نے اپنے بے کراں فضل ورحمت سے انسانوں کو راہ سعادت سے آشنا کردیا ہے اور اسی لئے کچھ فرائض مقرر کئے ہیں تاکہ ہم شعور وآگہی کے ساتھ جادۂ سعادت پر گامزن ہوسکیں سزا وعذاب کی دھمکیاں، اور دباؤ ہمارے ہوشیار رہنے اور راہ سعادت سے نہ بھٹکنے کا باعث ہوں گی۔ اگر کسی قسم کا دباؤ نہ ہوتا تو یقیناً ہم اپنی ذمہ داریاں بحسن وخوبی نہ نبھاتے۔

اگر کوئی شخص، انسان کی مطلق آزادی کا قائل اور خدا کی طرف سے بندوں کے اعمال پر ہر قسم کے دنیوی واخروی دباؤ اور سزاؤں کا منکر ہو تو گویا اس نے دین، انبیاء کی بعثت اور الٰہی شریعتوں ہی کا انکار کردیا ہے۔ حقیقت تو یہی ہے کہ خدا نے انسانوں کو انذار کیا ہے سزا دینے کا وعدہ کیا ہے۔ یہ سزائیں آخرت میں بھی ہیں اور دنیا میں بھی۔ بعض گناہوں کے لئے حدود و تعزیرات، دینوی سزاؤں اور سماجی دباؤ کا ایک نمونہ ہیں کیا ان سزاؤں اور جسمانی دباؤ کا کوئی انکار کرسکتا ہے؟ اور کیا ان کا انکار، اسلام اور تمام الٰہی ادیان کے انکار کے برابر نہیں ہے؟

حقوقی آزادی کی قسمیں: حقوقی آزادی کے مختلف پہلو ہیں لہذا ہر پہلو کا جداگانہ جائزہ لے کر ان کے متعلق اسلام کا نظریہ واضح کرنا ضروری ہے۔

(الف) سیاسی آزادی: سیاسی آزادی سے مراد یہ ہے کہ الیکشن اور قانون سازی کے میدان میں افراد آزاد ہیں۔ قانون سازی کا سارا عمل، سماج میں رہنے والے افراد کے ارادہ

نے ''تاریخ دمشق'' میں ۲۳ بتائی ہے، ابو شامہ نے ''تلخیص'' میں ۲۵ افراد کا ذکر کیا ہے۔ شبر املسی (وفات ۱۰۸۷ء) نے ۴۰ لکھا ہے جبکہ حافظ عراقی (وفات ۸۰۶ھ) نے ۴۲ نام گنائے ہیں۔ برہان حلبی نے ''شفا'' کے حاشیہ پر ۴۳ افراد کا ذکر کیا ہے۔ مجتہد زنجانی نے بھی یہی تعداد نقل کی ہے۔

مستشرقوں میں فرانس کے باشندہ ''بلاشر'' کا کہنا ہے کہ قرآن لکھنے والوں کی تعداد چالیس کے قریب تھی۔ مورخوں اور محدثوں نے جو فہرست پیش کی ہے وہ صحابہ کے اسلام لانے کے زمانہ کے لحاظ سے کچھ اس طرح ہے:

مکی دور کے کاتب: چاروں خلفاء، شرحبیل بن حسنہ (وفات ۱۸ھ) عبداللہ بن ابی السرح (وفات ۳۷ھ) خالد بن سعید بن عاص بن امیہ، طلحہ، زبیر (وفات ۳۶ھ) سعد بن ابی وقاص (وفات ۵۵ھ) عامر بن فہیرہ (وفات ۴ھ) علاء بن حضرمی (وفات ۲۱ھ) معیقب بن ابی فاطمہ (وفات ۴۰ھ) ارقم بن ابی الارقم (وفات ۱۱ھ) حاطب بن عمرو، حاطب بن ابی بلتعہ (وفات ۳۰ھ) مصعب بن عمیر، عبداللہ بن جحش، جہم بن قیس وسالم مولیٰ ابی حذیفہ (وفات ۱۲ھ)

مدنی دور کے کاتب: ابتداء میں زیادہ تر ابی بن کعب لکھا کرتے تھے اس کے بعد زید بن ثابت جنہیں مزید تجربہ ہوگیا تھا اور بدر کے اسیروں سے کتابت میں مہارت حاصل کرلی تھی۔ آنحضرت کی خدمت میں زیادہ رہنے لگے۔ جو لوگ اس کام میں بعد میں شریک ہوئے ہیں ان کے نام یہ ہیں: عبداللہ بن رواحہ (وفات ۸ھ) ثابت بن قیس (وفات ۱۲ھ) حنظلہ بن ربیع (وفات ۴۵ھ) حذیفہ بن یمان (وفات ۳۶ھ) علاء بن عقبہ، جہیم بن الصلت، عبداللہ بن زید (وفات ۶۳ھ) محمد بن مسلم (وفات ۴۳ھ) حنظلہ بن ابی عامر (وفات ۳ھ) عبداللہ بن عبداللہ بن ابی بن سلول، ابوزید قیس بن سکن، عقبہ بن عامر (وفات ۵۸ھ) معاذ بن جبل، ابوایوب انصاری (وفات ۵۲ھ) مغیرہ بن شعبہ (وفات ۵۰ھ) ابوسفیان اور ان کے دو بیٹے یزید و معاویہ، عبداللہ بن

کے مطابق انجام پائے اور نتیجہ میں قانون وحکومت کے جواز کا معیار اکثریت کی رائے ہوگی یہ مسئلہ، فلسفۂ سیاست کا ایک اہم موضوع ہے۔

اسلام کا اپنا ایک مخصوص سیاسی وحقوقی نظام ہے، جو وحی کے ذریعہ پیغمبر پر نازل ہوا ہے اسلام کی نظر میں انتخاب، عوام کا خداداد حق ہے جسے کوئی چھین نہیں سکتا لیکن قانون اور حکومت کے جواز کا سرچشمہ عوام نہیں بلکہ تائید الٰہی ہے۔ عوام حکومت اور قانون سازی کے لئے افراد کا انتخاب صرف دینی قوانین کے دائرہ ہی میں کرسکتے ہیں۔ حکومت کا حق صرف اللہ کو ہے اور اللہ نے یہ حق آنحضرت اور پھر ائمہ معصومینؑ کو دیا ہے۔ زمانۂ غیبت میں امام معصوم کی نیابت کے عنوان سے یہ حق ان افراد کے پاس ہے، جن میں معصوم کی جانب سے معین کیے گئے شرائط موجود ہوں۔

(ب) فکر وعقیدہ کی آزادی: اسلام، فکر وعقیدہ کی آزادی مغربی انداز میں تسلیم نہیں کرتا یعنی دین کا تعین ہر شخص کی ذاتی پسند سے نہیں ہے کہ جو جس دین کو چاہے اپنا لے۔ البتہ وہ کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا بلکہ واضح وآشکار دلیلوں کے ذریعہ اسلامی اصولوں کو بیان کرتا ہے پھر اسے قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے اسی لئے اسلام، تفتیش عقائد کی اجازت نہیں دیتا اگر کسی نے اسلام کا اظہار کردیا تو وہ اسے قبول کرلیتا ہے، سوء ظن کو جائز نہیں سمجھتا: فلا تقولوا لمن القیٰ الیکم السلام لست مومنا (نساء ۹۴/۴) جو کوئی تمہارے سامنے اظہار اسلام کرے اس سے یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں ہو۔ اسلامی نقطۂ نظر سے دینی عقیدہ میں زور زبردستی کی گنجائش ہی نہیں ہے لا اکراہ فی الدین۔ بلکہ عقیدہ کو مستحکم دلیلوں پر استوار ہونا چاہئے اگر کسی کو بقدر ضرورت تحقیق وجستجو کے باوجود دین نہ مل سکے وہ خدا کی نظر میں معذور ہے۔ اسلام کے سوا دوسرے ادیان کے ماننے والے بھی اسلامی ملک میں ایک مذہبی اقلیت کی حیثیت سے سکونت اختیار کرنے کا حق رکھتے ہیں اور انہیں اسلامی حکومت کی حمایت حاصل رہے گی۔ اسلام مذہب کے بارے میں تحقیق کرنے کی سب کو اجازت دیتا ہے۔ اگر کافر و مشرک افراد اسلام کے بارے میں تحقیق کرنے کے لئے اسلامی ملک میں پناہ لینا چاہتے ہیں تو اسلام ان کی بھی حمایت کرتا ہے۔ (توبہ/۶)

جہاں تک علمی، سیاسی اور سماجی مسائل کا تعلق ہے اسلام میں پوری آزادی ہے۔ ہر انسان اپنے نظریہ میں آزاد ہے۔

آخر میں اس نکتہ کی یاددہانی بھی ضروری ہے کہ اسلامی جہاد اپنا عقیدہ منوانے اور دوسروں کی فکر و عقیدہ کی آزادی چھیننے کے لئے نہیں ہے۔ اسلام اپنا عقیدہ منوانے کے لئے جنگ کی اجازت نہیں دیتا۔ کیوں کہ اپنا عقیدہ منوانے کے لئے جنگ کا مطلب عقیدہ میں زور زبردستی ہے اور اسلام طاقت کے بل پر عقیدہ تبدیل کروانے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ عظیم اسلامی مراکز میں دوسرے مذاہب کے پیروکار اطمینان و سکون کے ساتھ شریفانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اسلامی جہاد کے کچھ اور ہی مقاصد ہیں اسلامی جہاد کا ایک مقصد دبے کچلے مظلوموں کو نجات دلانا ہے قرآن کریم اس سلسلہ میں ارشاد فرماتا ہے:

وما لکم لاتقاتلون فی سبیل اللّٰہ و المستضعفین من الرجال و النساء و الولدان الذین یقولون ربّنا اخرجنا من ھذہ القریۃ الظالم اھلھا و اجعل لنا من لدنک ولیا و اجعل لنا من لدنک نصیرا (نساء ۷۵)

آخر تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ تم اللہ کی راہ میں ان دبے کچلے مستضعف مردوں، عورتوں اور بچوں، کو نجات دلانے کے لئے جہاد کیوں نہیں کرتے جو ظالموں کے چنگل میں پھنسے ہوئے خدا سے فریاد کررہے ہیں کہ پروردگار ہمیں اس بستی سے نجات دلا جہاں کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارے لئے ایک سرپرست و مددگار مقرر فرمادے۔

(ج) بیان کی آزادی: بیان کی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ انسان نہ صرف یہ کہ مخالف عقیدہ رکھنے کے جرم میں پریشان نہ کیا جائے بلکہ انہیں اپنا عقیدہ دوسروں کے سامنے پیش کرنے کی بھی اجازت دی جائے اس نظریہ کی بنیاد یہ ہے کہ علمی و سیاسی نظریات کے تبادلہ سے لوگوں کے علم و افکار پروان چڑھتے ہیں جبکہ آزادی کا گلا گھونٹ دینے سے بشری افکار و علوم منجمد ہوجاتے ہیں ان میں ٹھہراؤ بلکہ انحطاط و زوال آجاتا ہے لیکن اس نکتہ کی طرف بھی توجہ

ضروری ہے کہ بیان کی آزادی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جس شخص کے ذہن میں جو بھی خیال آئے سماج میں اس کی نشر واشاعت کرنے لگے، چاہے وہ نظریہ، سماج کے لئے مفید ہو یا نقصان دہ۔ سماج کو ترقی کی طرف لے جائے یا تباہی وویرانی، فتنہ وفساد کی طرف۔ بنابریں ہر سماج میں آزادی بیان کی کچھ حدیں مقرر کی جاتی ہیں۔ اسلام نے بھی آزادی بیان کا مکمل احترام کیا ہے چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون أحسنه اولٰئک الذین هدیهم الله و اولئک اولو الالباب (زمر / ۱۷)

میرے ان بندوں کو بشارت دیدیجئے جو باتوں کو غور سے سنتے ہیں اور جو بات اچھی ہوتی ہے اس کا اتباع کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جنہیں خدا نے ہدایت دی ہے۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو صاحبان عقل ہیں۔

ظاہری بات ہے کہ بہترین بات کا انتخاب اور اس کی پیروی صرف اسی وقت ممکن ہے جب بیان کی آزادی موجود ہو۔ ائمہ معصومینؑ کی سیرت بھی آزادی بیان کی بہترین گواہ ہے۔ لیکن یہ سب کچھ صرف اس وقت کے لئے ہے جب کسی قسم کے فتنہ وفساد کا اندیشہ نہ ہو۔ جب کبھی آزادی بیان سے ناجائز فائدہ اٹھا کر فتنہ وفساد اور انارکی پھیلانے کی کوشش کی جائے گی اس پر پابندی لگا دی جائے گی۔



عالم ربّانی
امیر المومنینؑ کی نظر میں

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور سید رضی نے، مولا کے ارشادات کا ایک حصہ، نہج البلاغہ کی شکل میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ نہج البلاغہ اپنے اختصار کے باوجود گوناگوں موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ انسان شناسی اور عمرانیات بھی اس کا ایک گوشہ ہے۔

امیر المومنینؑ نے مختلف مواقع پر انسانوں کو مال وثروت، اخلاق وشجاعت اور ایثار وجواں مردی کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے۔ ایک موقع پر آپ انسانوں کو علم کے لحاظ سے تین گروہوں میں تقسیم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

الناس ثلاثة فعالم ربّانی و متعلّم علی سبیل نجاةٍ وهَمَجٌ رَعاع اتباع کلّ ناعق،یمیلون مع کل ریح لم یستضیئو بنور العلم و لم یلجئو الیٰ رکن وثیق (کلمات قصار۔۱۴۷)

لوگ تین طرح کے ہوتے ہیں یا عالم ربانی ہیں یا راہ نجات پر چلنے والے طالب علم ہیں اور (یا علم کے تئیں مخالف موقف رکھنے والے) ایسے لوگ ہیں جو ہر آواز کے پیچھے چل پڑتے ہیں اور ہر ہوا کے ساتھ لہرانے لگتے ہیں۔ انھوں نے نور علم سے روشنی حاصل

کی ہے اور نہ کسی مستحکم ستون کا سہارا لیا ہے۔

عالم ربانی سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے علم و دانش کے اکتساب کے ساتھ ساتھ، خود کو ربانی صفات سے بھی آراستہ کیا ہے۔ یہ گروہ، انسانوں کا سب سے ممتاز گروہ ہے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو ابھی صف علماء میں تو داخل نہیں ہوسکا ہے لیکن کسب علم اور حصول دانش کے لئے کوشاں بھی ہے اور راہ نجات پر گامزن بھی۔ یہ ایسے طالب علموں کا گروہ ہے جن کے علم و دانش کے حصول کا مقصد، نجات پانا ہے صرف مال و زر اندوزی نہیں۔ یہ راہ زندگی طے کرنے اور حقیقی و ابدی سعادت و خوشبختی تک پہنچنے کے لیے علم حاصل کرتے ہیں۔

تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو ان دونوں گروہوں کے مد مقابل کھڑے ہوتے ہیں۔ یا سرے سے عالم ہی نہیں ہیں اور یا عالم تو ہیں مگر عالم ربانی نہیں ہیں۔ یا متعلم ہی نہیں ہیں۔ حصول علم و دانش کی راہ میں قدم ہی نہیں بڑھاتے اور یا کسب علم کے لئے کوشاں تو بہت ہیں لیکن مقصود علم، نجات پانا نہیں ہے، زر اندوزی اور کرسی پر براجمان ہونا ہے۔ علم تو حاصل کرتے ہیں مگر با مقصد علم نہیں۔

امیرالمومنین نے اس تیسرے گروہ کو "ہمج رعاع" کہا ہے۔ گندے نالوں اور تالابوں میں جمع بے شمار مچھروں کو جو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ادھر ادھر بکھر جاتے ہیں عرب "ہمج" کہتے ہیں۔ چونکہ ایسے لوگوں کے پاس اپنی کوئی فکر نہیں ہوتی یہ بے مایہ ہوتے ہیں۔ بے جڑ کے پودے ہوتے ہیں لہٰذا وہ سماج میں پیدا ہونے والی لہروں، تحریکوں اور آوازوں کے پیچھے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔ یہ بے ارادہ و بے اختیار لوگ ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان کے پاس خیر و شر کی تشخیص کی صلاحیت نہیں ہے بلکہ یہ تشخیص کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ "اتباع کل ناعق" ایک معمولی سے آواز بھی انھیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور ادھر ادھر بکھر جاتے ہیں۔ یہ شجر طیبہ کے مانند نہیں ہیں جس کی اصل

(جڑ) ثابت و مستحکم اور فرع (شاخ) آسمان کو چھو رہی ہو۔

عالم ربانی کون؟

عالم اسے کہا جاتا ہے جو مختلف مراحل طے کر کے مسائل کے ادراک اور ان کے متعلق اظہار رائے کے قابل بن گیا ہو لیکن ربانی سے کیا مراد ہے؟ اور عالم ربانی کسے کہا جا سکتا ہے؟ کیا صرف فقہ و اصول، تفسیر و حدیث، کلام و عرفان میں مہارت رکھنے والے کو عالم ربانی کہا جا سکتا ہے؟

لفظ ''ربانی'' رب سے منسوب ہے۔ خالقیت کے بعد خداوند عالم کی ایک عظیم صفت، ربانیت ہے۔ اللہ، ربّ العالمین ہے۔ عالم ربانی وہ عالم ہے جو خدا سے نسبت رکھتا ہو جس کا رشتہ خدا سے جڑا ہوا ہو۔ اس نے علم کے الٰہی پہلو کو فراموش نہ کیا ہو۔ علم کو خدا کی خوشنودی کے لئے حاصل کیا ہو۔ مال و زر، مقام و منصب، شہرت و دولت تک رسائی کے لئے نہیں۔

ایک ایسا سائنس داں جس کی نظر، علم کے ربانی پہلو پر ہے اور وہ سائنس کو الٰہی ربانیت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ کائنات کو وجود خدا سے جدا تصور نہیں کرتا وہ عالم ربانی ہے اگر چہ اس نے فقہ و حدیث و قرآن کا علم حاصل نہیں کیا ہے۔

عالم ربانی ہونے کیلئے صرف موضوع علم کافی نہیں ہے بلکہ ربانی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان زندگی کے سفر میں الٰہی ربوبیت کو فراموش نہ کرے اسے ہمیشہ مدّ نظر رکھے اس کی نگاہ، مبداء پر بھی ہو اور معاد پر بھی۔ اس کی زندگی کا سفر، الٰہی جادہ پر ہو۔ اگر اس نے اپنے اس سفر میں اللہ کو نظر انداز کر دیا تو پھر وہ ہرگز ربانی نہیں ہو سکتا۔ یہ اس شخص کے مانند ہے جو خدا پر عقیدہ تو رکھتا ہے لیکن عملی زندگی اس طرح گزارتا ہے جیسے اسے خدا پر عقیدہ ہی نہیں ہے۔

ربانی ہونے کے سلسلہ میں ایک دوسرا نکتہ یہ بھی ہے کہ جس طرح اللہ جل شانہ، موجودات عالم کی تربیت و پرورش میں موثر ہے۔ سب پر اپنے لطف و کرم کا سایہ کئے

ہوئے ہے۔ تمام موجودات، الٰہی ربوبیت کے سایہ میں پروان چڑھ رہی ہیں۔ اسی طرح عالم ربّانی بھی وہ عالم ہے جس کے سایہ میں دوسرے لوگ اپنی ارتقائی منزلیں طے کریں۔

اسی بات کو روایتوں میں ان لفظوں میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ لوگ یتیم ہیں ان کے سروں پر، علمی باپ کا سایہ نہیں ہے جو ان کی سرپرستی کرے۔ اب یہ ربانی علماء کی ذمہ داری ہے کہ ان یتیموں کے سر پر دست شفقت پھیر کے ان کی سرپرستی کا فریضہ انجام دیں۔ روایتوں میں ایتام آل محمد پر دھیان دینے کی تاکید ہوئی ہے۔ یعنی جو لوگ اپنے علمی و معنوی باپ سے محروم ہو گئے ہیں ان کا خیال رکھا جائے کہ وہ بھٹکنے نہ پائیں۔ ظاہر ہے کہ اس سرپرستی سے مراد، مادّی سرپرستی نہیں ہے بلکہ ہدایت اور معنوی رہنمائی ہے۔

ایک عالم ربّانی اپنے سماج سے رشتہ ناطہ توڑ کر گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر صرف علم و دانش اور عبادت و ریاضت میں مشغول نہیں رہ سکتا بلکہ تحقیق و مطالعہ، عبادت و ریاضت کے ساتھ ساتھ یتیمانِ آل محمد کی ہدایت و رہنمائی اور ان کی سرپرستی بھی ایک اہم فریضہ ہے اس فریضہ پر عمل کرنے والے علماء ہی عالم ربانی کہلانے کے حقدار ہیں۔



نص جلی

مجتبیٰ علی رضوی

خداوند عالم نے جب حضور سرور کائنات کو کامل دین کا پیغام دے کر بھیجا تو آپؐ کے بعد، دین کی حفاظت اور اس کی حیات جاودانی کے لئے حضورؐ کے جانشین بھی معین کئے۔ خود رسولؐ کی حدیث اس سلسلہ میں موجود ہے جس میں آپؐ نے متعدد جگہوں پر اپنے بعد آنے والے ائمہ کا تعارف کروایا ہے کہ میرے بعد علیؑ اور ان کے بعد حسنؑ و حسینؑ اور پھر حسینؑ کی اولاد میں سے نو جانشین ہوں گے اور نواں قائم ہوگا۔ (الحکم الزاھرہ ص ۱۱۴)

کئی جگہ آپ نے تعارف کروایا ہے۔ ظاہری بات ہے اسلام کی بنیاد ہی قرآن اور قول رسولؐ پر ہے رسولؐ، قرآن کی آیات کی تشریح و تفسیر کریں گے جو رسولؐ کہیں گے وہ حجت ہے۔ کیوں کہ (وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ) (النجم ۳) اور جانشین کا تعارف بھی رسولؐ ہی کروائیں گے چنانچہ غدیر میں جو آیت نازل ہوئی (یا ایھا الرسول بلغ........مائدہ ۵) پہنچا دو اے رسولؐ... تو اب تشریح و تفسیر، رسولؐ کا کام ہے لہٰذا رسول اسلامؐ نے کئی جگہ پر نص جلی کے ذریعہ ائمہ کا تعارف کروایا۔ اور ان کو پہچنوایا تا کہ کوئی بھی یہ نہ کہہ سکے کہ ہم کو نہیں معلوم۔

حدیث رسولؐ: ایک مرتبہ جابر بن عبداللہ انصاری نے رسولؐ سے اس آیت کی

تفسیر پوچھی (اطیعوا الله و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم) اولی الامر سے مراد کون افراد ہیں تو آپ نے فرمایا: **هم خلفائی یا جابر و ائمة المسلمین من بعدی اوّلهم علی بن ابی طالب ثمّ الحسن ثمّ الحسین ثمّ علی بن الحسین ثمّ محمد بن علی المعروف فی التوارٰة بالباقر ستدرکه یا جابر فاذا لقیته فاقرأه منی السلام ،ثمّ الصادق جعفرٌ بن محمد ثمّ موسیٰ بن جعفر ، ثمّ علی بن موسیٰ ثمّ محمد بن علی ثمّ علی بن محمد ثمّ الحسن بن علی ثمّ اسمی و کنیتی حجة الله فی ارضه و بقیّته فی عباده ابن الحسن بن علی** (اثبات الهداة ج ا ص ۵۰۱)

میرے بعد یہ خلیفۂ مسلمین ہیں ان میں پہلے علیؑ ہیں پھر حسنؑ ہیں پھر حسینؑ ہیں پھر علی بن حسینؑ ہیں پھر محمد بن علیؑ ہیں کہ جو توریت میں باقر کے نام سے جانے جاتے ہیں تم ان سے ملاقات کرو گے تو جب ان سے ملاقات کرنا ان کو ہمارا اسلام کہنا پھر ان کے بعد جعفر صادق بن محمدؑ ہیں پھر موسیٰ بن جعفرؑ ہیں پھر علی بن موسیٰؑ پھر محمد بن علیؑ ہیں ان کے بعد علی بن محمدؑ ہیں ان کے بعد حسن بن علیؑ ہیں پھر سب سے آخر میں میرے نام اور میری کنیت والے روئے زمین پر اللہ کی حجت ہیں۔ خدا کی طرف سے باقی رکھے گئے ہیں اس کے بندوں کے درمیان وہ حسن بن علیؑ کے فرزند ہیں

اسی طرح سے دوسری حدیث ملتی ہے جب رسول اللہ نے فرمایا علیؑ اور ان کی اولاد میں امام ہیں تو جابر نے سوال کیا کہ کون ہیں؟ تو آپ نے فرمایا:

"الحسن و الحسین سیدا شباب اهل الجنّة ثمّ زین العابدین فی زمانه علی بن الحسین ثمّ الباقر محمد بن علی و ستدرکه یا جابر فاذا ادرکته فاقرأه منیّ السلام ثمّ الصادق جعفر بن محمد ثمّ الکاظم موسی بن جعفر ثمّ الرضا علی بن موسی ثمّ التقی

الجواد محمد بن علی ثمّ النقی علی بن محمد ثمّ الزکی الحسن بن علی ثمّ ابنه القائم بالحق مهدی امتی محمد بن الحسن صاحب الزمانؑ الذی یملاء الارض قسطاً کما ملئت ظلماً و جوراً (الاحتجاج للطبرسی ج ۱ص ۶۹)

آپ نے فرمایا: حسن و حسین جنت کے جوانوں کے سردار، ان کے بعد اپنے زمانے کے زین العابدین علی بن حسین پھر محمد باقر بن علی اے جابر تم ان سے ملاقات کرو گے اور جب ان سے ملاقات کرنا تو ہمارا سلام ان تک پہچا دینا۔ پھر ان کے بعد جعفر صادق بن محمد ہوں گے پھر موسی بن جعفر کاظم بن جعفر ہوں گے پھر علی رضا بن موسی کاظم ہوں گے ان کے بعد محمد تقی جواد بن علی رضا ہوں گے ور پھر علی تقی بن محمد اور پھر الزکی حسن عسکری بن علی نقی ہوں گے پھر ان کے بعد ان کے فرزند قائم ہوں گے جو حق کے لئے کھڑے ہوں گے میری امت کے مھدی ہوں گے وہ محمد بن حسن ہیں آپ صاحب زمان ہیں زمین کو عدل سے بھر دیں گے جس طرح سے یہ ظلم و جور سے بھری ہوگی۔

کتاب اثبات الھداۃ میں ایک باب قائم ہے جس میں اس حدیث کو کہ رسول کے بعد بارہ جانشین ہوں گے اہل سنت کی معتبر کتابوں سے نقل کیا گیا ہے۔ (اثبات الھداۃ ج ۱ص ۵۰۱)

طبرسی نے ۱۲ امام کے سلسلہ میں سنّی ذرائع سے بہت سی حدیثیں نقل کی ہیں جن میں امام ابو محمد الحسن بن احمد السمر قندی محدث خراسان اور جابر بن سمرہ سے نقل کیا ہے کہ رسول نے فرمایا کہ میرے بعد ۱۲ جانشین ہیں اور سب کے سب قریش سے ہیں۔

ابن مسعود سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ سے سوال ہوا کہ آپ کے بعد کون اس امت کا خلیفہ ہوگا تو آپ نے فرمایا کہ ۱۲ افراد ہوں گے نقباء بنی اسرائیل کی تعداد کے برابر۔ شیخ ابو عبد اللہ جعفر بن محمد بن احمد الدوریستی سنّی ذرائع سے جناب عائشہ کی ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ نے مجھے بتایا کہ آپ کے بعد

ارقم (وفات ۴۴ھ) حویطب بن عبد العزیٰ (وفات ۵۴ھ) اس طرح ۴۵ افراد کتابت وحی میں شریک تھے(۱)

ابو عبد اللہ زنجانی ۴۳ افراد کا نام کاتبان وحی کے عنوان سے ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: "زید بن ثابت اور حضرت علی بن طالبؑ نے دیگر افراد سے زیادہ کتابت وحی میں حصہ لیا ہے"(۲)

حضرت علیؑ کے سلسلہ میں تقریباً بھی نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ آپ شروع ہی سے کتابت وحی میں مشغول تھے اور آخر تک اس کام کو جاری رکھا۔ آپ کے اس کام میں کبھی وقفہ نہیں آیا۔ (۳) یہاں یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ کاتبان وحی کے علاوہ کچھ اور افراد بھی تھے جو پیغمبر اسلامؐ کے لیے عہد نامے، صلح نامے یا خطوط وغیرہ لکھا کرتے تھے۔ اور یہ احتمال بعید نہیں ہے کہ ان لوگوں کا نام بھی کاتبان وحی کی فہرست میں شامل کر دیا گیا ہو۔ "یعقوبی" اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:

"رسول خدا کے پاس کچھ کاتب تھے جو وحی" خطوط، اور عہد نامے وغیرہ لکھتے تھے ان کے نام یہ ہیں: علی ابن ابی طالب، عثمان بن عفان، عمرو بن عاص بن امیہ، معاویہ بن ابی سفیان، شرحبیل بن حسنہ، عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح، مغیرۃ بن شعبہ، معاذ بن جبل، زید بن ثابت، حنظلہ بن ربیع، ابی بن کعب، جہیم بن صلت اور حصین بن نمیر (۴) معاویہ کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ وہ صرف خطوط و عہد نامے لکھتے تھے (۵)" ابن شہر آشوب" اپنی کتاب "مناقب" میں لکھتے ہیں: حضرت علیؑ زیادہ تر وحی کی کتابت کرتے تھے۔ البتہ وحی کے علاوہ دوسری چیزیں بھی لکھتے تھے۔ ابی بن کعب اور زید بن ثابت وحی لکھا کرتے تھے۔ زید اور عبد اللہ بن ارقم بادشاہوں کو خط لکھتے تھے۔ علاء بن عقبہ اور عبد اللہ بن ارقم دستاویزیں لکھتے تھے۔ زبیر بن عوام و جہیم بن صلت، صدقات قلمبند

۱۔ تاریخ قرآن، ڈاکٹر رامیار، ص ۲۶۲-۲۶۳

۲۔ تاریخ القرآن ص ۲۳

۳۔ تاریخ قرآن ص ۲۶۴

۴۔ تاریخ یعقوبی جلد ۲ ص ۸۰

۵۔ تاریخ قرآن، ڈاکٹر رامیار ص ۲۶۷

۱۲ جانشین ہوں گے راوی نے سوال کیا وہ کون ہیں؟ تو جواب میں کہا ان کے اسماء گرامی رسول نے مجھے لکھوائے ہیں لیکن جب راوی نے نام پوچھا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ (اثبات الھدا ۱ ج ۱ ص ۷۰۹)

محمد بن ابراہیم النعمانی اپنی کتاب ''الغیبۃ'' میں سنّی ذرائع سے نقل کرتے ہیں کہ محمد بن عثمان بن علان الذہبی البغدادی نے مختلف اسناد سے نقل کیا ہے جن میں جابر بن سمرہ، ابن عمر، ابن مسعود سے منقول ہے کہ رسول نے فرمایا میرے بعد ۱۲ جانشین ہیں اس کے بعد ۱۲ اماموں کے اسماء گرامی بھی ہیں (اثبات الھدا ۱ ج ۱ ص ۶۸۵)

خوارزمی نے اپنی کتاب میں یہ حدیث نقل کی ہے جسے سلیمان نے نبی سے نقل کیا ہے، سلیمان طویل گفتگو کے درمیان کہتے ہیں کہ انّ الله اوحی الیه لیلة الاسریٰ : یا محمد انّی خلقتك و خلقت علیاً و فاطمة و الحسن و الحسین و الائمة من ولده من نور من نوری ، و عرضت ولایتکم علی اهل السموات و الارض فمن قبلها کان عندی من المومنین و من جحدها کان عندی من الکافرین یا محمد تحبّ ان تریٰهم ؟ قال۔ قلت نعم یا رب ۔فقال لی التفت عن یمین العرش فالتفت فاذا انا بعلی و فاطمه و الحسن و الحسین و علی بن الحسین و محمدبن علی و جعفر بن محمد و موسی بن جعفر و علی بن موسی و محمد بن علی و علی بن محمدو الحسن بن علی و المهدی فی ضحضاح من نور فقال یا محمد هولاء الحجج و هو الثائر من عترتك و الحجة الواجبة لاولیائی ۔ (اثبات الھدا ۱ ج ۱ ص ۶۹۷)

خداوند عالم نے رسول کو شب معراج وحی کی اور فرمایا: اے محمد میں نے تم کو خلق کیا اور علی و فاطمہ و حسن و حسین اور ان کی اولاد میں سے ائمہ کو اپنے ایک نور سے خلق کیا۔ اور تم لوگوں کی ولایت کو اہل اسمان و زمین کو پیش کیا جس نے قبول کر لیا وہ میرے نزدیک مومن اور اور جس نے انکار کیا وہ کافر ہے۔ اے محمد کیا تم ان کو دیکھنا چاہو گے؟ آپ

نے فرمایا ہاں اے پروردگار۔ خدا نے فرمایا عرش کی داہنی طرف دیکھو تو جب میں متوجہ ہوا تو دیکھا علی و فاطمہ و حسن و حسین و علی بن حسین و محمد بن علی و جعفر بن محمد و موسی بن جعفر و علی بن موسی و محمد بن علی و علی بن محمد و الحسن بن علی و المھدی ہیں۔ بس پروردگار نے فرمایا اے محمد یہ سب کے سب حجت ہیں اور یہ انقلاب لانے والے ہیں اور میرے اولیاء کے لئے حجت واجبہ ہیں۔

محمد بن علی الکراجکی نے اپنی کتاب الاستبصار فی النص علی الائمۃ الاطہار میں 'کتاب دفاین النواصب سے جو محمد بن احمد شاذان کی ہے سنّی ذرائع سے نقل کیا ہے کہ عمر بن الخطاب نے رسولؐ سے نقل کیا ہے کہ:قال رسول الله لعلی ابن ابی طالب یا علی انا نذیر امتی ، انت ھادیھا و الحسن قائدھا و الحسین سایقھا و علی بن الحسین جامعھا ، و محمد بن علی عارفھا و جعفر بن محمد کاتبھا و موسی بن جعفر محسبھاو علی بن موسی معبرھا و منجیھا و طاردمبغضیھا و محمد بن علی قائمھا و سابقھا و علی بن محمد سائرھا و عاملھا و الحسن نادیھا و معطیھا و القائم الخلف ساقیھا ناشدھا انّ فی ذلک لایات للمتوسمین (اثبات الھداۃ ج ۱/ص ۵۹۹)

رسول نے علی سے فرمایا اے علی میں اپنی امت میں ڈرانے والا ہوں اور تم اس کے ھادی ہو حسن قائد ہیں حسین اسے سیراب کرنے والے ہیں علی بن حسین اکٹھا کرنے والے ہیں، محمد بن علی جاننے والے ہیں جعفر بن محمد کاتب امت ہیں (علوم لکھنے والے) موسی بن جعفر امت کا حساب رکھنے والے ہیں علی بن موسی تعبیر رکھنے والے اور نجات دینے والے اور بغض رکھنے والوں کو ٹھکرانے والے ہیں محمد بن علی قیام کرنے والے اور سبقت کرنے والے ہیں علی بن محمد، عالم ہیں حسن، عطا کرنے والے ہیں القائم ساقی ہیں یہ سب متوسمین کے لئے اللہ کی نشانی ہیں۔

احمد بن محمد بن عیاش نے سنّی ذرائع سے نقل کیا ہے کہ سلمان نے رسول خدا سے

نقل کیا ہے: انّ اللہ لم یبعث نبیاً و لا رسولاً الا جعل له اثنی عشر نقیباً فهل علمت من نقبائی الاثنا عشر الذین اختارهم الله للامامة ؟ فقلت الله و رسوله اعلم ثمّ ذکر حدیثاً طویلاً عن النبی یشتمل علی اسمائهم ، علی و الحسن و الحسین و علی بن الحسین و محمد بن علی و جعفر بن محمد و موسی بن جعفر و علی بن موسی و محمد بن علی و علی بن محمد و الحسن بن علی ثمّ فلان سماه باسمه ابن الحسن المهدی (اثبات الهداۃ ج ۱ ص ۷۰۹)

بے شک خدا نے سارے انبیاء کو بارہ نقیب دے کر بھیجا ہے کیا جانتے ہو کہ میرے نقیب کون ہیں جن کو خدا نے امامت کے لئے منتخب کیا ہے؟ سلمان نے لاعلمی کا اظہار کیا پھر رسولؐ نے ایک طویل حدیث میں سب کے اسماء بتائے وہ علی ہیں حسن ہیں حسین ہیں علی بن حسین ہیں محمد بن علی وجعفر بن محمد، موسی بن جعفر، علی بن موسی، محمد بن علی، علی بن محمد، حسن بن علی پھر وہ ہیں جنکا نام میرے نام پر ہے وہ فرزند حسن مہدی ہیں۔

عبداللہ بن عمرؓ پیغمبرؐ سے نقل کرتے ہیں: انّ اللہ اوحی الیه فی لیلة الاسراء انت سید الانبیاء و علی سید الاوصیاء یا محمد انّی خلقت علیا و فاطمه و الحسن و الحسین والائمة من نور واحد ثمّ قال تقدم امامك فتقدمت ، فاذا علی بن ابی طالب و الحسن و الحسین و علی بن الحسین و محمد بن علی و جعفر بن محمد و موسی بن جعفر وعلی بن موسی ومحمد بن علی و علی بن محمد و الحسن بن علی و الحجة القائم کانّه کوکب دری فی وسطهم فقلت یا رب من هولاء فقال هولاء الائمة وهذا القائم (اثبات الهداۃ ج ۱ ص ۷۱۰)

خداوند عالم نے رسول کی طرف وحی کی معراج کی شب کہ آپ سید الانبیاء اور علی سید الاوصیاء ہیں اے محمد ہم نے علی و فاطمہ وحسن وحسین کو اوران کے بعد والے ائمہ کو

ایک نور سے خلق کیا ہے۔ خدا نے فرمایا آگے بڑھو میں آگے بڑھا۔ تو دیکھا علی ہیں فاطمہ وحسن وحسین ہیں علی بن حسین، محمد بن علی، جعفر بن محمد، موسی بن جعفر علی بن موسی، محمد بن علی، علی بن محمد اور حسن بن علی اور حجت قائم ہیں فرزند عسکری جو ان ائمہ کے درمیان چمکتے ہوئے ستارے کی مانند ہیں میں نے خدا سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں تو فرمایا یہ سب امام ہیں اور یہ قائم ہیں۔

ان روایات سے صاف ظاہر ہے کہ رسول کے جانشین کا خود رسول نے تعارف کروایا ہے یہ سب خداوند عالم کی طرف سے منصوص تھے اب اگر کسی مسلمان کا رسالت پر ایمان کامل ہے تو پھر امامت کے سلسلے میں ان احادیث کو دیکھنے کے بعد کسی شک کی گنجائش رہ ہی نہیں جاتی۔ بات بالکل واضح اور روشن ہے کہ امام صادقؑ کے بعد امام کاظمؑ ہیں پھر امام صادقؑ نے بھی اپنے جانشین کا تعارف کروایا ہے۔

فیض بن مختار نے امام صادقؑ سے سوال کیا کہ آپ کے بعد کون ہے جانشین؟ اسی وقت امام کاظمؑ تشریف لائے اس وقت امام کے بچپن کا زمانہ تھا۔ امام صادقؑ نے آپ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ھذا صاحبکم فتمسک بہ یہ تمہارے امام ہیں ان کے دامن سے وابستہ رہنا (اصول کافی ج ۲/ص ۸۲)

اسی طرح معاذ بن کثیر نے بھی باتوں کے ضمن میں امام صادقؑ سے آپ کے بعد آپ کے جانشین کے سلسلے میں سوال کیا تو امام صادقؑ نے امام کاظمؑ کی طرف اشارہ کیا اس وقت امام کاظم کا بچپنا تھا (اصول کافی ج ۲/ص ۸۲)

مفضل بن عمر سے روایت ہے کہ ہم امام صادقؑ کی بزم میں تھے کہ اس وقت ابو ابراہیم موسی بن جعفر تشریف لائے آپ اس وقت جوان تھے امام صادقؑ نے فرمایا ان کے بارے میں میری وصیت سنو اور قبول کرو اور یہ جان لو کہ یہ امام ہیں امر امامت ان کے پاس ہے اور مورد اطمینان لوگوں کو خبردار کرو۔

منصور بن حازم نے امام سے سوال کیا کہ اگر آپ کو کچھ ہو جائے تو امام کون ہوگا

امام نے فرمایا کہ "اذا کان ذلک فھو صاحبکم" اگر ایسا ہو جائے یہ تمھارے حاکم ہیں یہ کہتے ہوئے امام کاظمؑ کے شانہ پر ہاتھ مارا (اصول کافی ج ۲/ص ۸۳)

سلیمان بن خالد کہتے ہیں کہ امام ابو عبداللہ نے ابا الحسن کاظمؑ کو بلایا ہم لوگ بھی اس وقت خدمت امام میں تھے آپ نے ہم لوگوں سے فرمایا" علیکم بھذا فھو واللہ صاحبکم "ان کی اطاعت کرو خدا کی قسم یہ ہمارے بعد تمھارے حاکم ہیں (اصول کافی ج ۲/ص ۸۲)

ثقۃ الاسلام کلینی نے بھی اپنے اصحاب سے اس طرح نقل فرمایا ہے کہ معاذ بن کثیر نقل کرتے ہیں کہ ہم نے امام صادق سے سوال کیا کہ آپ کے بعد کون امام ہوگا؟ امام نے عبد الصالح امام کاظمؑ کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا یہ ہمارے بعد امام ہوں گے (اعلام الوری ص ۲۸۸)

اتنے دلائل کے بعد اب امامت میں شک نہیں رہنا چاہئے۔ حالات مناسب نہیں تھے اس لئے امام نے علی الاعلان اپنے جانشین کا اعلان نہیں کیا بلکہ صرف ضرورت کے تحت خواص شیعہ کو آگاہ کر دیا۔ کیونکہ خدشہ اس بات کا تھا کہ حکومت وقت اس چراغ ہدایت کو کہیں گل نہ کر دے حالات کے غیر مناسب اور غیر محفوظ ہونے کا اندازہ امامؑ کی وصیت سے ہوتا ہے۔ جس میں آپ نے ظاہری طور پر اپنے بعد کے لئے پانچ جانشین معین کئے جن میں خود خلیفۂ وقت، حاکم مدینہ، امام کی زوجہ امام کے فرزند محمد اور خود امام کاظمؑ اسی لئے جب خلیفہ نے امام صادق کے بعد آپ کے جانشین کے بارے میں دریافت کیا اور حاکم مدینہ کو حکم دیا کہ جو بھی ہو اسے تلاش کر کے ختم کر ڈالو تو اگر امام اپنے وارث کو علی الاعلان پہچنواتے تو قتل یقینی تھا لھذا اس طرح کی وصیت کے ذریعہ اپنے جانشین کی حفاظت کی (سیرۂ پیشوایان ص ۴۱۴/)

اب رہی لوگوں کی بات کہ یہ کیسے منحرف ہو گئے تو ایسا نہیں تھا کہ منحرف ہونے والے لوگ کوئی الگ تھے اور نئے تھے۔ انھیں امام کی طرف سے جانشین کے معین

ہونے کا پتہ نہیں چلا بلکہ مدینہ کے اطراف کے تھے اور امام کو جانتے تھے لیکن امام نے جو اسماعیل کے امام ہونے کا انکار کیا اس بات کو نہیں مانا بلکہ اپنے ہی نظریہ پر باقی رہے جب امام صادقؑ کو اپنا امام مانا رسول کا جانشین مانا تو اب ان کے بعد کے لئے بھی ان کے جانشین کو ان کے کہنے پر کیوں نہ مانیں اور جہاں تک تعیین کا مسئلہ ہے امام نے کئی مقام پر امام موسی کاظم کا تعارف کروایا تھا اور خود رسول کی حدیث بھی موجود ہے تو پھر یہ نظریہ کیونکر باقی رہ جائیگا کہ اسماعیل امام ہیں؟ چونکہ اب تک امام کا جانشین بڑا بیٹا ہی ہوا ہے۔ لھذا اب بھی وہی ہو یہ لازم نہیں ہے۔

جناب اسماعیل کی امامت کا نظریہ: چونکہ اسماعیل، امام صادقؑ کے سب سے بڑے بیٹے تھے اور امام ان کو بہت زیادہ چاہتے تھے تو بعض لوگوں نے یہ گمان کیا کہ اسماعیل ہی امام ہیں کیونکہ اب تک امامت بڑے بیٹے ہی کو ملی ہے یہ صرف غلط فہمی ہے ایسا ضروری نہیں ہے امام صادقؑ اور امام کاظمؑ کے احوال میں ایسی کوئی دلیل یا روایت نہیں ہے جو اسماعیل کی امامت کی طرف اشارہ کرے بلکہ امام کی نفی اور انکار ضرور ملا ہے یا ایسی روایت ضرور ملی ہے کہ جب لوگوں نے جناب اسماعیل کے متعلق سوال کیا تو امام نے ان کے امام ہونے سے انکار کر دیا۔

بحار الانوار۔ ج ۴۷ امام صادقؑ کی اولاد اور اسماعیل کی امامت کی نفی وانکار کے سلسلہ میں ایک پورا باب قائم ہے (ص ۲۴۱) چنانچہ روایت ہے کہ چونکہ اسماعیل امام کے سب بڑے فرزند تھے امام بھی ان سے بہت محبت کرتے تھے امام کی جناب اسماعیل سے بے تحاشہ محبت کو دیکھ کر بعض شیعوں کو یہ گمان ہوا کہ یہ ہی قائم ہیں اور اپنے والد کے بعد ان کے خلیفہ ہیں۔ بڑے بیٹے ہونے اور امام کی شدید محبت کے سبب یہ گمان ہوا لیکن جناب اسماعیل کا اپنے والد کی زندگی ہی میں عریض نامی مقام پر انتقال ہو گیا اور مدینہ لاش لائی گئی اور بقیع میں دفن کئے گئے امام جعفر صادقؑ نے بہت گریہ کیا اور تشیع جنازہ میں بغیر ردا اور پا برہنہ گئے چونکہ بہت سے لوگ امام صادق کے بعد

اسماعیل کے امام ہونے کے معتقد تھے اور موت سے انکار کر رہے تھے اس بنا پر امام صادقؑ نے راستہ میں کئی جگہ جنازے کو روک کر چہرہ کھول کر دکھلوایا تا کہ جن لوگوں کو یہ گمان ہے کہ امام صادقؑ کے بعد اسماعیل امام ہیں ان کو یہ یقین آجائے کہ اسماعیل کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ امام نہیں ہیں وہ مر چکے ہیں آپ اس گمان کو ختم کرنا چاہتے تھے کہ وہ امام اور زندہ ہیں جناب اسماعیل کی موت اور امام کے ردعمل کے بعد بہت سے شیعوں نے اس عقیدہ اور گمان کو ترک کر دیا لیکن جو لوگ نہ تو خاص شیعہ میں سے تھے اور نہ ہی راویوں میں سے تھے بلکہ وہ لوگ جو دور دراز کے علاقوں اور مضافات کے رہنے والے تھے وہی لوگ اس عقیدہ پر باقی رہے۔

امام صادقؑ کے انتقال کے بعد کچھ لوگوں نے اما کاظمؑ کو امام مانا اور کچھ لوگ اس بات کے قائل ہوئے کہ جناب اسماعیل تو مر گئے ہیں لیکن امامت ان کے بیٹے محمد کو ملی ہے کیونکہ ان کا گمان تھا کہ امامت باپ کے بیٹے کو ہی ملنا چاہیے بھائی کی بنسبت بیٹا زیادہ مستحق ہے ایک اور گروہ ہوا جو اسماعیل کے زندہ ہو جانے کا قائل ہوا لیکن ایسے افراد آج کل بالکل ناپید ہیں۔ ان دو گروہوں کو اسماعیلہ کہا جانے لگا اور آج کل جو ان سے متعلق مشہور ہے وہ یہ ہے کہ ان کا گمان ہے کہ اسماعیل کے بعد امامت ان کے فرزندوں میں منتقل ہو رہی ہے اور ان کا آخری آخر الزمان ہوگا (اقتباس از بحار الانوار ج ر ۴۷ ص ر ۲۴۲) اس کے علاوہ احادیث جن میں امام جعفر صادقؑ نے جناب اسماعیل کی امامت کی نفی کی ہے۔ ابن راشد کہتے ہیں کہ امام صادقؑ سے اسماعیل کے سلسلے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا ''عاص عاص لا یشبهنی ولا یشبه أحدا من آبائی'' یہ غیر معصوم ہیں گنہگار ہیں اور نہ یہ مجھ سے مشابہ ہیں اور نہ یہ میرے اجداد میں کسی سے (یعنی امامت ان کو نہیں ملی) کیونکہ امام معصوم اور ایک دوسرے سے مشابہ ہوتے ہیں (بحار الانوار ج ر ۴۷ ص ر ۲۴۷)

عبید بن زرارہ نقل کرتے ہیں کہ جب امام صادقؑ سے جناب اسماعیل کا تذکرہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا ''لا واللہ لایشبهنی ولا یشبه احدا من آبائی'' نہیں خدا کی قسم وہ نہ ہی مجھ سے مشابہ ہیں اور نہ میرے اجداد میں سے کسی سے ''یعنی امام نہیں

ہیں امام فضل وکمالات میں مشابہ ہوتا ہے''(بحارالانوار ج ر ۴۷ص ۲۴۷)

اس کے علاوہ کئی اور دیگر روایات ہیں جن میں امام صادقؑ نے امام کاظمؑ کی امامت کو بتایا ہے جیسے کہ فیض بن مختار کے ساتھ ایک طویل گفتگو میں امام نے اپنے بعد آنے والے امام کا تعارف کروایا اور ان کو دکھایا کہ موسی کاظمؑ امام ہیں اور فرمایا کہ جو صفت اور خوبی جناب یعقوب نبی خدا نے جناب یوسف نبی خدا میں دیکھی (یعنی آثار نبوت) ویسی ہی خوبی اور صفت میں نے موسی کاظم میں دیکھی ''یعنی آثار امامت''(بحار الانوار ج ر ۴۷ص ۲۵۹)

امام صادقؑ نے اسماعیل کی امامت کی تائید نہیں کی بلکہ روایتیں ملتی ہیں کہ جن میں سختی سے امام نے منع کیا ہے اور یہ کہا کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

قال ابو عبد اللهؑ : انّ شيطاناً ولع بابنی اسماعيل يتصور فی صورته ليفتن به الناس و انّه لا يتصور فی صورته نبی ولا وصی نبی فمن قال لك من الناس انّ اسماعيل ابنی حتّى لم يمت فانّما ذلك الشيطان تمثّل له و صورته اسماعيل ما زلت (بحارالانوار ج ر ۴۷ص ۲۶۹)

یعنی شیطان نے میرے اسماعیل کی طرف رغبت کی وہ اسماعیل کی شکل میں لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے مجسم ہوتا ہے وہ کسی نبی یا ولی نبی کی شکل میں مجسم نہیں ہوتا اگر تم میں سے کوئی شخص کہے میرا بیٹا اسماعیل زندہ ہے مرا نہیں تو شیطان اس کے لئے اسماعیل کی شکل میں مجسم ہوا ہے۔

اسماعیل کی امامت کے معتقدین اسماعیلیہ کے نام سے امام صادقؑ کے بعد مشہور ہوئے اور شیعوں کے ایک فرقہ کے نام سے جانے جانے لگے اس کے علاوہ بھی کئی فرقے وجود میں آئے جن میں ایک فطحیہ بھی ہے جو محمد افطح کو امام مان بیٹھے تھے چونکہ محمد بن افطح کی امامت بھی مشہور ہوئی تھی امام صادق ، امام کاظمؑ سے اس کا بھی تذکرہ کرتے ہیں کہ میرے بعد آپ کے بھائی محمد بھی مسند امامت پر بیٹھنے کا دعوی کریں گے

آپ کو وہ بھی برداشت کرنا پڑے گا (الارشاد ۔ص ر ۲۸۶، بحار الانوار ج ر ۴۷ ص ر ۲۶۱)

اسماعیلی فرقے: امام صادقؑ کے بعد شیعوں میں کئی فرقے وجود میں آئے جن میں سے ایک اسماعیلیہ ہے جو امام صادق کے بعد منحرف ہو گیا اور آپ کے بعد ساتواں امام جناب اسماعیل کو ماننے لگا ان میں بھی تین گروہ ہیں۔

پہلا اسماعیلیہ خاص: ان کا کہنا ہے کہ اسماعیل امام ہیں اور ان کا انتقال نہیں ہوا بلکہ زندہ ہیں اور غائب ہیں اور ایک دن ظہور کریں گے (فرق و مذاہب ص ۳ ر ۶۵)

اسماعیلوں کا دعوی ہے کہ چونکہ امام کا بڑا بیٹا امام ہونا چاہئے تھا اور امام صادقؑ نے جانشین بنایا بھی تھا اس لئے یہ جانشین امام ہیں (فرق و مذاہب ص ر ۶۹ و اعلام الوری)

شیخ مفید نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ امامت کے لئے امام کا زندہ ہونا ضروری ہے جبکہ اسماعیل پہلے ہی انتقال کر چکے تھے اور لوگوں کے سامنے ان کی تدفین ہوئی اور امام نے راستہ میں جگہ جگہ ان کے جنازہ کو لوگوں کو دکھایا تا کہ کسی طرح کا شبہ نہ ہو اور یہ کہ امام نے اسماعیل کو جانشین معین کیا اس کی کوئی دلیل نہیں ہے یہ صرف اس بنا پر تھا کہ اسماعیل امام کے بڑے بیٹے تھے اور اسماعیلیوں کا وہم ہے امام بڑا بیٹا ہی ہوتا ہے (اعلام الوری ص ر ۲۹۱، ارشاد و مفید ص ر ۲۴۰، بحار الانوار ج ر ۴۸ ص ر ۲۱)

دوسرا گروہ مبارکہ: یہ گروہ، اسماعیل کی موت کا قائل ہے ان کا کہنا ہے کہ امامت ان کے بیٹے محمد کی طرف منتقل ہو گئی کیونکہ امام حسن اور امام حسین کے علاوہ دو بھائیوں میں امامت کہیں اور نہیں ہو سکتی ہے لھذا اسماعیل کے انتقال کے بعد امامت ان کے بھائی کو نہیں ملے گی بلکہ امام ان کے بیٹے محمد ہونگے (فرق الشیعہ ص ر ۷۹۔۸۰، بحار الانوار ج ر ۴۸ ص ر ۱۸)

تیسرا گروہ اسماعیلیہ قرمطہ: یہ ۲۶۰ میں نمودار ہونے والی مبارکہ کی ہی شاخ ہے محمد بن اسماعیل کی موت کے سلسلے میں یہ لوگ اختلاف کر بیٹھے ان کا کہنا ہے کہ محمد بن اسماعیل زندہ

۱۔ البرہان جلد ۱ ص ۳۳۱

ہیں اور ساتویں اور آخری امام ہیں اور امامت اسی سات میں محدود ہے اگر چہ آغاز اسماعیل سے ہوا لیکن بداء واقع ہو گئی اور امامت اسماعیل سے منتقل ہو کر ان کے بیٹے محمد کی طرف آ گئی اور اس قول کی دلیل میں امام کی طرف سے ایک حدیث پیش کرتے ہیں "ما بدا اللہ فی شیٔ کما بدا لہ فی اسماعیل "یعنی جس طرح اسماعیل کے سلسلے میں خدا کے لئے بدا واقع ہوئی س طرح کسی دوسرے مورد میں نہیں ہوئی جبکہ شیخ مفید اس کو رد کرتے ہیں کہ امامت میں بدا واقع نہیں ہو سکتی بلکہ یہ بدا اسماعیل کی موت کے سلسلے میں ہے کہ موت سے پہلے جب اسماعیل بیمار ہوئے تو اس وقت ان کی غیر حتمی موت لکھی تھی یعنی وہ موت جو ٹل سکتی ہے تو امام صادقؑ نے اس وقت ان کی صحت اور زندگی کے لئے دعا کی تو ان کی دعا مستجاب ہوئی (فرق و مذاہب ص/۷۰-۷۱)

ائمہ اثنیٰ عشر کے علاوہ دوسرے ائمہ کے بارے میں نظریات کو اس لحاظ سے بھی باطل کیا جا سکتا ہے اور اس کے علاوہ ائمہ معصومین جو بارہ ہیں ان کے بارے میں احادیث و روایات اتنی متواتر ہیں کہ کسی اور چیز کے بارے میں اتنی متواتر نہیں ہیں اور خود رسول نے بھی فرمایا تھا کہ حضرت عیسیٰ نبی اللہ کے بارہ حواریین تھے اور میرے بھی ۱۲ جانشین ہیں ۱۰۰ نہیں ہیں اور اس کے علاوہ بھی رسول اللہ نے کئی جگہ معین کر دیا تھا۔

امام صادقؑ نے اسماعیل کو اپنا جانشین بنایا ہو اس کی کوئی دلیل نہیں ملتی (اعلام الوری ص/۲۹۱) اور یہ کہ رسول کے سو جانشین ہوں گے تسبیح کے سو دانوں کی طرح۔ اس کی کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ قول رسول ہی حجت ہے اور رسول اور دیگر ائمہ سے بہت سی روایات منقول ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ امام صادقؑ کے بعد امام کاظمؑ ہی امام ہیں خود حکومت وقت کا آپ پر ظلم کرنا قید و بند کی زحمتیں اور آپ کی شہادت یہ سب امام کاظمؑ کی امامت پر دلالت کرتی ہیں۔



کرتے تھے۔ عثمان، خالد اور ابان (دونوں سعید بن عاص کے بیٹے ہیں) مغیرۃ بن شعبہ حصین بن نمیر، علاء بن حضرمی، شرحبیل بن حسنہ، حنظلہ بن ربیع اسدی اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح (جو کتابت میں خیانت کیا کرتا تھا۔ رسول خدا نے اس پر لعنت بھیجی اور وہ مرتد ہوگیا) رسول خدا کے لیے کتابت کے فرائض انجام دیتے تھے۔"(۱)

ابن ابی الحدید کہتے ہیں:

محقق موزخوں کی رائے ہے کہ وحی صرف علی بن ابی طالب اور زید بن ثابت وزید بن ارقم لکھا کرتے تھے حنظلہ بن ربیع اور معاویہ بن ابی سفیان، بادشاہوں اور قبائل کے سرداروں کے نام خط وغیرہ لکھا کرتے تھے۔"(۲)

مذکورہ بیانات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ پیغمبر اکرمؐ کے صرف چند اصحاب کے کاتب وحی ہونے پر اتفاق نظر ہے۔ اور بہت سے افراد جن کا نام کاتبان وحی کی فہرست میں نظر آتا ہے وہ وحی کے کاتب نہیں تھے بلکہ دوسری چیزیں لکھا کرتے تھے۔

"رافعی" اس نکتہ کا ذکر کرنے کے بعد کہ کاتبان وحی کے سلسلہ میں اختلاف ہے لکھتے ہیں:

"علی بن ابی طالب، معاذ بن جبل، ابی بن کعب، زید بن ثابت اور عبداللہ بن مسعود، ان پانچ افراد کے کاتب وحی ہونے پر اتفاق نظر ہے۔"(۳)

۳۔ کتابت قرآن کے وسائل:

نزول قرآن کے زمانہ میں کتابت کے وسائل بہت سادہ اور معمولی تھے۔ مسلمان ہر اس چیز کو کام میں لاتے تھے جس پر لکھا جاسکتا تھا۔ قرآن کریم کی کتابت اور اس کی تدوین سے متعلق بہت سی حدیثوں میں ان وسائل کا ذکر ہوا ہے اور قرآن کے تمام ماہرین اس سلسلہ میں متفق ہیں:

۱۔ "عُسُب" عسیب کی جمع ہے کھجور کی وہ ٹہنی جس سے پتیاں صاف کردی گئی ہوں۔ اس کے چوڑے حصہ پر قرآن لکھتے تھے۔

۱۔ مدخل التفسیر ص ۲۴۰ ۲۔ مدخل التفسیر ص ۲۴۱ ۳۔ اعجاز القرآن۔ ص ۳۴

قرآن ــــ گمراہ نہ کرنے والا رہنما

یاد رکھو کہ یہ قرآن وہ ناصح ہے جو دھوکہ نہیں دیتا اور وہ ہادی ہے جو گمراہ نہیں کرتا۔ وہ بیان کرنے والا ہے جو غلط بیانی سے کام لینے والا نہیں ہے۔ کوئی شخص اس کے پاس نہیں بیٹھتا ہے مگر یہ کہ جب اٹھتا ہے تو ہدایت میں اضافہ کر لیتا ہے یا کم سے کم گمراہی میں کمی کر لیتا ہے۔

یاد رکھو! قرآن کے بعد کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوسکتا ہے اور قرآن سے پہلے کوئی بے نیاز نہیں ہوسکتا ہے۔ اپنی بیماریوں میں اس سے شفا حاصل کرو اور اپنی مصیبتوں میں اس سے مدد مانگو کہ اس میں بدترین بیماری کفر و نفاق اور گمراہی و بے راہ روی کا علاج بھی موجود ہے۔ اس کے ذریعہ اللہ سے سوال کرو اور اس کی محبت کے وسیلہ سے اس کی طرف رخ کرو اور اس کے ذریعہ مخلوقات سے سوال نہ کرو۔ اس لئے کہ مالک کی طرف متوجہ ہونے کا اس کا جیسا کوئی وسیلہ نہیں ہے اور یاد رکھو کہ وہ ایسا شفیع ہے جس کی شفاعت مقبول ہے اور ایسا بولنے والا ہے جس کی بات مصدقہ ہے۔ جس کے لئے قرآن روز قیامت سفارش کردے اس کے حق میں شفاعت قبول ہے اور جس کے عیب کو وہ بیان کردے اس کا عیب تصدیق شدہ ہے۔ روز قیامت ایک منادی آواز دے گا کہ ہر کھیتی کرنے والا اپنی کھیتی اور اپنے عمل کے انجام میں مبتلا ہے لیکن جو اپنے دل میں قرآن کا بیج بونے والے تھے وہ کامیاب ہیں لہٰذا تم لوگ ان ہی لوگوں اور قرآن کی پیروی کرنے والوں میں شامل ہو جاؤ۔ اسے مالک کی بارگاہ میں رہنما بناؤ اور اس سے اپنے نفس کے بارے میں نصیحت حاصل کرو اور اپنے خیالات کو متہم قرار دو اور اپنے خواہشات کو فریب خوردہ تصور کرو۔

(خطبہ نمبر/۱۷۶)

کچھ نہج البلاغہ کے بارے میں

جناب محمد ابراہیم نژاد

۴۰۰ ھ میں سید رضی نے نہج البلاغہ جمع کر دیا اس کے بعد حضرت امیر المؤمنین کے کلام کے لئے علماء نے بہت مفید اور بے بیش قیمت کام انجام دئے ہیں قرآن کریم کے علاوہ کسی دوسری کتاب پر اب تک اتنا کام نہیں ہوا ہے۔ہم یہاں ان کاموں کی فہرست پیش کر رہے ہیں تا کہ علماء کی کوشش اور ان کی عظمت سامنے آجائے۔

۱: قلمی نسخے: اب تک نہج البلاغہ کے ۱۳۱ قلمی نسخوں کے نمونے سامنے آئے ہیں جو پانچویں اور دسویں صدی ہجری کے نسخے ہیں قلمی نسخے اتنے ہی نہیں ہیں ہاں اب تک جن نسخوں سے آگاہی ہو سکی ہے ان کی تعداد ۱۳۱ ہے۔[۱]

گزشتہ صدیوں میں پیش آنے والے حادثات کے باوجود نہج البلاغہ اور اس کے اسناد و مدارک کے قلمی نسخوں کا باقی رہ جانا کسی معجزہ سے کم نہیں ہے۔

۲: نہج البلاغہ کی شرحیں اور تفسیریں: علامہ تہرانی نے الذریعہ، جلد ۱۴ میں ۱۰۰ تفسیروں کی طرف اشارہ کیا ہے۔علامہ امینی نے "الغدیر"، جلد ۴ میں ۸۱ شرحوں کے نام لکھے ہیں اور شیخ حسین جمعہ نے اپنی کتاب "شروح نہج البلاغہ" میں ۲۱۰ شرحوں کا مکمل ذکر کیا ہے۔

۳: نہج البلاغہ کے سلسلہ کی فہرستیں: نہج البلاغہ کی شرحیں اور تفسیریں اتنی زیادہ ہیں کہ بعض علماء نے ان کی فہرست ہی تیار کردی ہے تا کہ نہج البلاغہ پر جتنا کام ہو چکا ہے اس کی فہرست ایک نظر میں لوگوں کے سامنے آجائے ان میں سے رضا استادی کی تالیف ''کتاب نامہ نہج البلاغہ'' بھی ہے جس میں ۳۷۰ شرحوں اور ترجموں وغیرہ کا ذکر ہے۔

منشور عدالت: جو کتاب ''اخ القرآن'' کے لقب سے ملقب ہے اور زمانہ جسے کلام خدا سے کم اور کلام بشر سے مافوق مانتا ہے اس کے منشور کے بارے میں گفتگو مشکل ہے۔ نہج البلاغہ کی عظمت اور بزرگی اور اس کتاب کے زندگی بخش کارنامہ کا بیان صاحبان نظر اور بزرگوں کے قلم ہی سے ممکن ہے۔

نہج البلاغہ کی تابناک تصویر پیش کرتے ہوئے امام خمینی نے فرمایا: نہج البلاغہ شفاء کے لئے دوا، انفرادی، اجتماعی زخموں کا مرہم ہے۔ انسان اور ایک بڑے انسانی معاشرہ کے لئے مختلف پہلوؤں والا ایک مجموعہ ہے جس میں اس زمانہ سے لے کر آنے والے ہر زمانے کے لئے غور وفکر کا مواد موجود ہے زمانہ چاہے جتنا آگے بڑھ جائے حکومتیں اور قومیں وجود میں آئیں اس مجموعہ میں مفکرین اور محققین جتنا غور کرتے رہیں اور غرق ہوتے چلے جائیں۔[۲]

ماہر اسلامیات مفکر و عظیم معاصر مصنف، استاد محمد رضا حکیمی، نہج البلاغہ کے زندہ جاوید منشور اور اس میں پوشیدہ انسان ساز پیغام کے بارے میں فرماتے ہیں ''نہج البلاغہ فیض ملفوظ اور نور مکتوب ہے ہم اس کتاب کو جس رخ سے بھی دیکھیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انوار حیات کے آفاق جلیل میں سورج کو دیکھ رہے ہیں۔

الفاظ کے سانچہ میں توحید خالص کے معارف اور معرفت کے اعلیٰ حقائق، نہج البلاغہ میں موجود ہیں اسی طرح اگر ہم اس پر ایک سرسری نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اس میں۔ قرآن کریم کی شناخت کے عظیم پہلو۔

۔پیغمبرؐ اسلام کی سیرت واخلاق کے اعلیٰ نمونے
۔علم الٰہی، بلند مقامات، تعلیمی اور تربیتی گوشے، ائمہ معصومین کی سیاسی اور اجتماعی شان
۔انبیاء کے حالات، رسالت الٰہی کے مختلف پہلو
۔جاہلیت کے جہنم کی فطرت سوز تاریکیاں
۔رسالت کی ذمہ داریاں نبھانے کی راہ میں ٹکراؤ کی وسیع وعریض کھائیاں
۔گلشن دنیا کو تباہ کرنے میں خودغرض جابران تاریخ کے کرتوت اور ان کی تباہی
۔حقائق ہستی کی عظمتیں
۔جہان مادّہ اور مادّہ کائنات کی پیدائش کی کیفیت
۔منظر کائنات کا عظیم الشان شکوہ
۔مخلوقات کی رازدارانہ چمک دمک
۔ارواح وجود کی غیبی آواز
۔عظیم معبد ملکوت میں فرشتوں کی عبادت کا زمزمہ
۔ستاروں کا آسمانی نغمہ
۔سمندروں کی وسیع موجوں کی تعجب خیزی
۔نگارستان گیتی کے دل آویز خدوخال
۔چیونٹیوں کی حیرت انگیز زندگی کے پراسرار دریچے
۔پتھروں اور پہاڑوں کا بولتا سکوت
۔دشت ووادی کی سرگوشیاں
۔گلشنوں اور گھونسلوں میں نسیم صبح کی مستانہ چال
۔طلوع وغروب کی پرتلاوت نمازیں
۔ایام وتکالیف شرعی کی عظمتیں
۔قرآنی طرز کے انسانوں کے احوال واخلاق

۔حق وانصاف کے نفاذ میں مہلت نا آشنا انقلابی تحریکوں کے بیان کے ساتھ حقیقی انقلاب کی تصویر کشی

۔انسانی ضمیروں کی حقیقی اور ملتہب انسانیتیں

۔روحانی شبستانوں میں دوستداران خدا کا نالہ وفریاد

۔رات کے روحانی شبستان میں خدادوستوں کی عشق گستری

۔حق تعالی سے شبانہ راز و نیاز کے وقت نماز و قیام میں الٰہی آیتوں کی تلاوت کی عاشقانہ خوشی

۔جلال ہستی کے روبرو تقدیس کے جاودانہ سوروں کی نغمہ سرائی

۔امت محمدی کی نماز معراج کی ادائیگی کی تاکید اور سرمدی تجلیات سے اتصال کے سمندر

۔عدالت کے دفاع کی صلابت

۔محرومیت پیدا کرنے والے ظالموں کے سروں پر برسنے والا آہنی گرز

۔بینواؤں اور بھوکے لوگوں کی فریادرسی اور دستگیری

۔فرد و معاشرہ کی زندگی میں تباہ کن اور فضیلت سوز فقر کا چہرہ

۔مستضعفین کے خون سے رنگین ہونے والے دسترخوانوں اور عیاشیوں پر تمسخر آمیز تہدید خیز نظر

۔خطاکار ذمہ داروں کی صادقانہ نقاب کشائی

۔دنیادوست اور ضعیف الایمان علماء کی بھرپور مذمت

۔انسانی کرامت کے لئے ننگ و عار اور بے ادب کارندوں سے تحقیر کن کنارہ کشی

۔دوسروں کے مشوروں اور افکار کا احترام اور اظہار نظر کے سلسلہ میں صاحبان نظر کی تشویق

۔دل و جاں کو صیقل کرنے والی شیریں نصیحتیں

۔گور و گورستانوں کی باتوں پر خاموشی

۔جہان ناپائدار کی ناشناختہ واقعیت

۔موت وقیامت کی ہولناک گذرگاہیں

۔عالم بقاء کی جاوداں نعمتوں کی عظمت
۔زندگی کے حقیقی مقاصد اور پابند دین انسان کا فرض شناس اور فرض پذیر چہرہ
۔طوفان خیز جنگ میں روح شجاعت کا اساطیری تجسم
۔جہاد اور فرض شناسی
۔وقت اور اس سے استفادہ
۔انسان اور تاریخ بشریت و اسلام کا تابناک مستقبل
البتہ یہ سرسری طور پر نہج البلاغہ کا ایک نامکمل جائزہ ہے۔[۳]

دو عیسائیوں کا نظریہ:

نہج البلاغہ کے زندہ و جاوید پیغام اور اس کے اعجاز کے سلسلہ میں بہت کچھ کہا گیا ہے اس مختصر سے مضمون میں ان تمام چیزوں کو جمع کر دینا ممکن نہیں ہے لھذا صرف دو عیسائی علماء کا بیان نقل کیا جا رہا ہے عیسائی مورخ و دانشور جارج جرداق کہتا ہے۔

نہج البلاغہ جس طرح عرب کے لئے خیر اور اقدار کا سرمایہ ہے اسی طرح تمام دوسرے انسانوں کے لئے بھی ذخیرہ ہے جس معاشرہ میں انسان تفاہم اخلاص اور تعاون کے ساتھ ایک مقصد لیکر زندگی گزارتا ہے اس سماج کے لئے بھی ذخیرہ ہے۔ کیونکہ سچائی بٹوارے کی چیز نہیں ہے اور نہ سچائی پر عمل کا ضابطہ قابل تبعیض و تقسیم ہے۔ اسی وجہ سے جو شخص معاشرہ میں عرب کو غیر عرب پر ترجیح نہیں دیتا (اچھا کردار استثنائی چیز ہے) وہ کسی خاص شخص کو عام پر ترجیح نہیں دیتا اور ایسا انسان اپنے بھائی کو بھی وہ چیز نہیں دیتا جو کسی غیر کو نہ دیتا ہو ایسا شخص کسی انسان کو دوسرے انسان کا استحصال بھی نہیں کرنے دیتا یہ تمام انسانوں کو آزاد اور مساوی دیکھنا چاہتا ہے وہ ممکنہ حد تک فقر اور محتاجی کو دور کرنا چاہتا ہے تاکہ تمام انسان سکون و اطمینان کی زندگی گزاریں۔ جنگ اور ظلم و ستم سے نفرت کرتا ہے۔ انصاف کے سایہ میں لوگوں کو امن، صلح اور برادری کی دعوت

دیتا ہے تاکہ کوئی کسی ظالم کا لقمہ نہ بنے، وہ انسان تو کیا جانوروں کے ساتھ بھی عدل وانصاف کا برتاؤ کرتا ہے۔ وہ چیونٹی کے منھ سے جو کا دانہ نہیں چھینتا پرندوں پر ظلم نہیں کرتا اور ایسا ہی انسان آخری دم تک ان مقاصد کو پانے کے لئے اپنی زندگی وقف کردیتا ہے۔[۴]

فواد جرداق اپنے شعر میں کہتا ہے: علیؑ ستمگروں کے لئے کمر توڑنے والے اور مظلوموں کی مضبوط پناہ گاہ ہیں۔

علیؑ عدالت کا ایسا مضبوط قلعہ ہیں کہ بے مثال اخلاق اور شمشیر وقلم جسکی ہمیشہ نگہبانی کرتے رہتے ہیں۔ جن سرزمینوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے جارہے ہیں اور جہاں فقر وفاقہ کا منحوس سایہ منڈلا رہا ہے ان کی فریاد سننے کے لئے کون ہے؟ صرف علیؑ اور ان کی نہج البلاغہ۔ وہ نہج البلاغہ جو حکومت عدل کا منشور ہے جو ظلم وستم اور زیادتیوں کا قلع قمع کرنے والی کتاب ہے۔[۵]

اس حصہ کو ہم حضرت ہی کے گہربار کلام سے ختم کردینا چاہتے ہیں آپ ارشاد فرماتے ہیں:

۱۔ ایاک والاستئثار بما النّاس فیہ اسوۃ

اجارہ داری سے بچو اور جس چیز میں تمام لوگ شریک ہیں اسے اپنی ذات سے مخصوص نہ کرو

۲۔ انّ للوالی خاصۃً و بطانۃً فیھم استئثار تطاول وقلّۃ انصاف فی معاملۃ

حکمرانوں کے کچھ نزدیکی افراد اور رشتہ دار ہیں جو خودسری مطلق العنانی، لوگوں کے حقوق پر دست درازی اور انصاف کی کمی کا شکار ہیں (مالک اشتر کے عہدنامہ کا ایک حصہ)

۳۔ منھومان لا یشبعان: طالب علم و طالب دنیا

دو بھوکے کبھی سیر نہیں ہوتے ایک طالب علم اور دوسرا طالب دنیا

۴۔ قیمۃ کل امرء ما یحسنہ

ہر شخص کی قیمت اس چیز سے وابستہ ہے جسے وہ اچھا سمجھتا ہے

جناب مالک اشتر کا عہد نامہ یا حقوق بشر کا منشور:

محققین اور دانشوروں کے درمیان جارج جرداق، حضرت علیؑ کی انسان ساز تعلیمات اور معاشرہ ساز ہدایات کا شیفتہ تھا۔ مولا علیؑ کے کلمات نے اسے ایسا عاشق بنا دیا کہ اس نے ''الامام علی صوت العدالۃ الانسانیۃ'' جیسی تحقیقی کتاب لکھ ڈالی۔

اس نے پہلی بار عالمی حقوق انسانی کے منشور کا مالک اشتر کو لکھے جانے والے مولا علی کے عہد نامہ سے موازنہ کیا۔ اس نے ایک ایک حصہ مولا علی کے کلام سے ملا کر دیکھا اور پھر منطقی دلیل سے علی کے اصول کی برتری ثابت کی۔ دونوں میں بنیادی فرق بیان کرتے ہوئے جارج نے جھوٹوں اور مکاروں کے چہرے سے نقاب اٹھائی اور عالمی استکبار کو رسوا کرتے ہوئے لکھا:

''قارئین کی نظر میں بلا شک وتردید وہ حقوق واضح ہو گئے جو علیؑ نے انسانوں کے لئے بغیر کسی پیچیدگی ابہام اور پردہ پوشی کے بیان کئے تھے۔ ہم اس فصل میں ان مطالب کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں تاکہ قارئین مزید توضیح اور تحقیق سے بے نیاز ہو جائیں۔ لیکن حقوق کے بارے میں علی بن ابی طالبؑ کے نظریات کی عظمت بیان کرنے اور ان کے اصول وقوانین میں ان کی عظمت کو واضح کرنے کے لئے ہم نے یہ سوچا کہ ''حقوق کے عالمی منشور'' کے اہم ترین مواد بیان کر دیئے جائیں تاکہ اس عالمی منشور اور علیؑ کے مکتب فکر کا بنیادی فرق قارئین کو محسوس ہو جائے اور لوگ سمجھ لیں کہ دونوں نظریات کیسے ہیں۔

البتہ اس سلسلہ میں ہم مختصراً اتنا کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ انسانی مسئلہ کی روح اور حقیقت کے نقطۂ نظر سے علیؑ کے مکتب فکر اور عالمی حقوق بشر کے درمیان کے اختلاف کا سمجھ پانا بہت مشکل ہے۔ البتہ زمانہ کے اختلاف کے پیش نظر عبارات اور جزئیات میں اختلاف ناگزیر ہے۔ لیکن بنیاد کے اعتبار سے اقوام متحدہ کے پیش کئے ہوئے منشور حقوق بشر میں کوئی بنیادی بات ایسی نہیں ہے جو حضرت علیؑ کے دستور اصول میں نہ پائی

جاتی ہو۔ اسکے علاوہ علیؑ کے دستور میں وہ چیزیں بھی مل جائیگی جو اس منشور میں موجود نہیں ہیں۔"

جارج جرداق نے دونوں منشور کے درمیان چار بنیادی فرق کی نشان دہی کی ہے جس کو دیکھنے کے بعد حقوق بشر کا نعرہ لگانے والوں کی عوام فریبی اور حیلہ گری کا پردہ فاش ہو جاتا ہے۔ اور یہ سمجھ میں آتا ہے کہ عالمی استکبار نے مستضعفین کا کس طرح استحصال کیا ہے۔

جارج جرداق کا کہنا ہے کہ ان دونوں منشوروں کے درمیان جو فرق ہے وہ ہماری نظر میں چار نکتوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ پہلا فرق یہ ہے کہ عالمی حقوق بشر کا منشور دنیا کے تمام ملکوں یا اکثر ملکوں کے ہزاروں مفکرین نے مل کر بنایا ہے لیکن علوی اصول و قوانین تنہا علیؑ نے وضع کیے تھے۔

۲۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ حقوق بشر کا منشور بننے سے ہزار برس سے بھی زیادہ علیؑ نے یہ اصول وضع کیے تھے۔

۳۔ تیسرا فرق: حقوق بشر کا منشور بنانے والے یا اس کے دفعات کو جمع کرنے والوں نے اپنے کارنامہ پر اتنا ناز کیا ہے اور اتنی خودستائی کی ہے کہ پوری دنیا کو اپنی ڈینگوں سے پر کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنی اتنی تعریف کی کہ انسانی ذوق، ضمیر، راستی اور صداقت ان سے نفرت کرنے لگی۔ کیونکہ انہوں نے غرور اور خود فریبی کے مظاہرہ سے لوگوں کو خستہ کر دیا۔ لوگوں اور ملتوں کے دوش پر ہزاروں منتوں کا بار گراں رکھ دیا ہے۔ حالانکہ علیؑ بن ابی طالب نے فروتنی سے کام لیا ہے۔ کبھی برتری اور بزرگی کا اظہار نہیں کیا بلکہ آپ نے لوگوں سے معذرت چاہی اور خدا کی بارگاہ میں بخشش کی دعا کرتے رہے۔

۴۔ چوتھا اہم فرق یہ ہے کہ منشور حقوق بشر پیش کرنے والوں یا اسے منظوری دینے والی زیادہ تر وہی حکومتیں ہیں جنہوں نے انسانی حقوق کو پامال کیا ہے اور اس منشور کو کچل ڈالنے کے لئے جنہوں نے ہر جگہ اپنی فوجیں روانہ کی ہیں۔ حالانکہ علیؑ کے قدم جہاں

بھی گئے جہاں بھی آپ کی تلوار چمکی یا جہاں بھی آپ کی گفتگو ہوئی وہاں ظلم کا پردہ چاک ہو گیا۔ استعمار کے بادل چھٹ گئے۔ استبداد کا سینہ لرز اٹھا۔ زمینیں ہموار ہو گئیں۔ پھر آپ نے انسانوں کے حقوق کے دفاع کی راہ میں شہادت کا درجہ حاصل کر لیا۔ حالانکہ اس سے پہلے اس راستہ میں ہزاروں بار آپ منزل شہادت اور مقتل تک سر بکف پہونچ چکے تھے۔ ۶

اس کے بعد علیؑ کی ہمہ جہت اور الٰہی شخصیت کے لئے جارج جرداق رقم طراز ہے کہ "چونکہ میں عیسائی ہوں اس وجہ سے کوئی بھی مجھ پر تعصب کا الزام نہیں لگا سکتا۔" کتاب "علی صوت العدالۃ الانسانیۃ" پہلی بار ایک جلد میں چھپی جسے اس نے آیۃ ... العظمیٰ بروجردیؒ کی خدمت میں پیش کیا پھر تکمیل کے بعد یہ کتاب پانچ جلدوں میں طبع ہوئی۔

سید رضی کے والد کی وفات:

سید رضی اور ان کے بڑے بھائی سید مرتضی ۴۰۳ھ تک نعمت وجود پدر سے بہرور تھے ایک ایسے باپ کے زیر سایہ زندگی گزار رہے تھے جو پاک طینت اور بے نظیر عالم تھے۔ بچوں کے لئے گھر میں مہربان باپ، دلسوز مربی اور دوست کی حیثیت رکھتے تھے اچھے اخلاق، بہترین رفتار، اور اچھے برتاؤ کا مکمل نمونہ تھے۔ ابو احمد نے دین وملت کی خدمت میں اپنا وقت صرف کیا۔ دردمندوں، ضعیفوں کے دفاع کی ذمہ داری کماحقہ نبھادی۔

ابن ابی الحدید معتزلی نے نہج البلاغہ کی مشہور زمانہ شرح میں سید رضی کے احوال میں لکھا ہے:

سید رضی کے والد (نقیب) ابو احمد بڑے جلیل القدر انسان تھے۔ بنی عباس اور آل بویہ کی حکومت میں آپ کو بلند مقام حاصل تھا۔ بہاء الدولہ نے "طاھر او حد" (یگانہ پاک سرشت) کا خطاب دیا۔ آپ پانچ مرتبہ طالبین کی نقابت کے منصب پر فائز ہوئے۔ اسی عہدے پر فائز رہتے ہوئے آپ کی بینائی بھی چلی گئی۔ ۸

۲۔ "لخاف" لخفہ کی جمع ہے = باریک اور پتلا پتھر

۳۔ "رقاع" رقعہ کی جمع ہے = کاغذ کا پرزہ، درخت کے پتے اور کھال کا ٹکڑا۔

۴۔ "ادیم" ادم یا ادم کی جمع ہے = جانوروں کی دباغی کی ہوئی کھال۔

۵۔ "اکتاف" کتف کی جمع ہے = اونٹ یا دنبہ کی ہڈی

۶۔ "اقتاب" قتب کی جمع ہے = لکڑی کا وہ تختہ جو اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھنے کے لیے رکھا جاتا تھا۔

۷۔ "اضلاع" ضلع کی جمع = جانوروں کی پسلی کی صاف کی ہوئی ہڈی

۸۔ "حریر" = ریشم کا کپڑا

۹۔ "قراطیس" قرطاس کی جمع = کاغذ

۱۰۔ "قطاط" = ایک طرح کی لکڑی (۱)

ڈاکٹر رامیار لکھتے ہیں:

"عرب قوم، کاغذ سے قدیم زمانہ ہی سے واقف تھی۔ اس زمانہ میں کاغذ، ہندوستان میں بنتا تھا اور وہاں سے یمن بھیجا جاتا تھا پھر گرمی اور سردی کے تجارتی قافلے یمن سے شام، شام سے روم لے جاتے تھے۔ عربستان (حجاز) اس زمانہ میں جنوب و شمال کے درمیان تجارت کے لیے واسطہ اور رابطہ کا کام کرتا تھا۔ (۲)

کتابت قرآن کی کیفیت:

(الف) ترتیب نزول کے مطابق کتابت. سورہ کا آغاز بسم اللہ الرحمن الرحیم سے ہوتا تھا کاتبان وحی پیغمبر کے حکم سے سورہ کی آیتوں کو اس کے نزول کی ترتیب سے لکھتے تھے۔ انھیں نزول آیات کی ترتیب کی رعایت کا پابند بنایا گیا تھا۔ حقیقت یہی ہے کہ نازل شدہ آیتوں کی ترتیب و تدوین کا کام پیغمبر اسلام کی براہ راست نگرانی میں انجام پاتا تھا۔ اور کسی کاتب کو اپنے اجتہاد اور ذاتی رائے کو دخل دینے کی اجازت نہیں تھی۔ ان ہی آیتوں کی تنظیم، ترتیب اور تدوین سے ایک سورہ بنتا تھا قرآن مجید نے مثل لانے کا

۱۔ بحار الانوار جلد ۹۲ ص ۳۴

۲۔ تاریخ قرآن ص ۲۷۔۲۸

کے مقابلہ میں ہیچ سمجھا جاتا ہے۔ ۱۰
۔رضی اور مرتضی آپس میں برابر ہیں عظمت وجلالت کے خطوط ان دونوں کے درمیان مساویانہ تقسیم ہوئے ہیں۔۱۱

شعروشاعری:

"جب عاطفہ اور تخیل مخصوص آہنگ میں ڈھل جائیں تو اسے شعر کہتے ہیں۔۱۲"

اس بنا پر شعر، فکر کو پیش کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ کیونکہ جب حسین الفاظ بہترین آہنگ اور دلچسپ بیان کے قالب میں کوئی بات کہی جاتی ہے تو وہ سننے والے پر اثر انداز ہوتی ہے۔

جن میں لطیف سلیقہ اور ذوق شعری موجود ہے وہ مختلف مسائل میں اپنے تفکرات و تخیلات کو بہترین انداز میں پیش کر کے داد سخن دیتے ہیں۔ مثلاً حمد ودعا، مدح وثنا، جنگ وحماسہ، عشق و عاشقی، صحر، کوہستان ومہتاب اور شبوں کی تصویر کشی، اچھے انداز سے کرتے ہیں۔

اب اگر شاعر کا مقصد مقدس، مختلف پہلوؤں کا حامل اور مکتب کی پابندی ہے تو اس کے اشعار قابل قدر اور لائق ستائش ہوتے ہیں۔ لیکن اگر مقصد کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے تو وہ اشعار مخرّب اخلاق اور منحرف کرنے والے ثابت ہوتے ہیں۔

اسی وجہ سے ہمارے بہت سے بزرگ اور صاحب تقویٰ علماء نے حقیقتوں کے بیان کے لئے کارساز اور انقلابی طریقہ یعنی شعر کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا ہے اور الٰہی مقاصد کو دل نشین اشعار اور الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ان ہی صاحبان فصاحت وبلاغت میں صحیح فکر اور ذوق سلیم کے حامل سید رضی بھی تھے۔ آپ نے سب سے پہلے اپنے بزرگوں اور خاندان والوں کے بارے میں قصیدہ کہا۔ اس وقت آپ کی عمر صرف نو سال کی تھی لیکن اس میں آپ نے ایسی مہارت کا ثبوت پیش کیا کہ لوگ ششدرہ گئے۔

یہاں یہ بتا دینا مفید ہوگا کہ ابو احمد آخر عمر تک اس عہدہ پر فائز نہیں رہے بلکہ ۳۸۰ھ میں اپنی زندگی ہی میں صحت وسلامتی کی حالت میں ان تمام عہدوں کو اپنے لائق اور باتدبیر بیٹے سید رضی کے حوالہ کر دیا۔ اور ۹۷ سال کی عمر میں آپ نے معاشرہ کے محرومین کی مشکلات کو حل کرنے کی انتھک کوشش کرتے ہوئے بغداد میں دار فانی کو الوداع کہا اور اپنے لائق خدمات کے ساتھ جوار رحمت خدا میں پہونچ گئے۔

مجلس فضل ومعرفت کو زینت دینے والے نیز محرومین کی مدد کرنے والے اس صاحب ایثار عالم کی رحلت کی خبر سے تمام شیعوں میں غم کی لہر دوڑ گئی جنازہ میں شرکت کرنے اور پرسہ دینے کے لئے ایک انبوہ امڈ پڑا۔ علماء و دانشور اور محبان خاندان عصمت وطہارت کا ایک ہجوم تھا، جو اشک حسرت برسا رہا تھا پھر غسل وکفن کے بعد ماہتاب آسمان فقاہت سید مرتضی نے آفتاب علم پر نماز پڑھی۔

پہلے جنازہ کو اپنے گھر میں سپرد کیا گیا اس کے بعد آپ کا جنازہ کربلا منتقل کر دیا گیا۔

آپ کی وفات پر نامی گرامی شعراء نے مرثیے لکھے جن میں سید رضی، سید مرتضی، ابو اسحاق صابی، ابو العلائی معرّی کے دلسوز مرثیے مشہور ہیں۔ ۹

عرب کے مشہور شاعر ابو العلاء ابو احمد کو خطاب کرتے ہوئے اپنے شعر میں فرماتے ہیں:

آپ نے ہمارے درمیان یادگار کے طور پر دو ستارے چھوڑے ہیں جن کی روشنی صبح وشام منور کرتی رہتی ہے۔

۔ دو عظیم شخصیتیں بلند اوصاف کے ساتھ پرورش یافتہ ہیں دونوں ہی صاحب مرتبت وعفت ہیں۔

دونوں صاحبان فضیلت، ہم رتبہ ہیں جود وعطا کے وقت بارش رحمت کا منظر پیش کرتے ہیں، دو چاند ہیں جو ظلمتوں میں اجالا پھیلاتے ہیں۔

۔ دونوں خاص عظمت کے حامل ہیں۔ جب یہ زبان کھولتے ہیں تو اہل نجد کو ان

آپ نثر و نظم کی زبان سے بخوبی مانوس تھے اور ہمیشہ پرورش لوح و قلم کے قائل رہے اسی مداومت کی بناپر بہت تھوڑی مدت میں آپ کے اشعار نسیم سحری پر سبقت لے گئے اور آپ کا آوازہ دور دور تک پھیل گیا۔ آپ نے کہنہ مشق عرب شعراء کے درمیان ایسے ماہرانہ اور ادیبانہ نمونے پیش کئے کہ سب سے آگے نکل گئے لوگوں نے ''اشعر قریش'' اور ''اشعر عرب'' کے لقب سے نوازا۔ نقادان فن نے بڑی تعریفیں کیں۔

آپ کے شعر و ادبی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ مختار شعر ابی اسحاق الصابی: سید رضی کے دوست مشہور مصنف ابو اسحاق صابی کے اشعار کا انتخابی مجموعہ۔

۲۔ الجید من شعر ابن الحجاج: یہ کتاب ''الحسن من شعر الحسین'' کے نام سے بھی مشہور ہے۔ مشہور شاعر ابن حجاج کا نام حسین ہے۔ سید رضی نے ان کے اچھے اشعار اس مجموعہ میں جمع کئے ہیں۔

۳۔ الزیارات فی شعر ابی تمام

۴۔ ابو اسحاق صابی اور سید رضی کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی ہے اس کا بھی ایک مجموعہ تھا اگر وہ دستیاب ہوتا تو عربی ادب کا عمدہ سرمایہ ہوتا۔

۵۔ دیوان سید رضی بقول ثعلبی چار جلدوں پر مشتمل ہے۔

فرض شناس شعر:

مسلمانوں کا طلائی عہد یعنی، چوتھی صدی اور پانچویں صدی کا ابتدائی حصہ مختلف علوم و فنون کا حیرت انگیز زمانہ رہا ہے اس دور میں اسلام کے بلند معارف مثلاً فقہ، کلام، تفسیر، حدیث، ادبیات، اور دوسرے علوم مثلاً ریاضیات، فلسفہ، نجوم، ھندسہ، طب نے ایسی ترقی حاصل کی جیسی ترقی اسلامی تاریخ میں اس سے پہلے بہت کم نظر آتی ہے۔ اس عہد میں بڑے بڑے علماء و دانشوروں نے مختلف علمی اور ثقافتی میدان میں اپنے جوہر دکھائے۔

۱۔ مجلہ البرہان جلد ا ص ۳۳

اس زمانہ میں ادب کا کافی رواج رہا مناسب حالات اور ثقافت دوست شاہان آل بویہ کی ترغیب سے بہت سے عظیم شعراء اور ادباء منصۂ شہود پر ابھرتے نظر آئے ادبی جلسے اور نشستیں منعقد ہوئیں۔ بڑے بڑے دیوان اور اشعار کے مجموعہ سامنے آئے۔

نابغۂ دوران سید رضی ان تمام علمی محافل کے صدر نشین رہے اور آپ نے اپنی علمی شمع کی روشنی سے انہیں منور کیا آپ کے منفرد خصوصیات نے آپ کو اور آپ کے دیوان کو دوسروں سے ممتاز بنایا ہم یہاں بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں:

ا۔ سید رضی نے اپنے فن سے مال ومنال اور مقام ومرتبہ حاصل کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی آپ نے شعر سے اپنی شخصیت نہیں بنائی بلکہ شعر وشاعری کو ایک جہت اور مقصد عطا کیا۔ مشہور دانشور اور اشعار عرب سے واقف، وزیر صاحب بن عباد، عرب کے مشہور شاعر متنبی کے اشعار پر اعتراض کیا کرتے تھے لیکن وہ سید رضی کے اشعار کے ایسے شیدائی تھے کہ انھوں نے ایک شخص کو آپ کے اشعار نقل کرنے کے لئے بغداد بھیجا۔ جب سید رضی کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے صاحب کے کمالات اور قلم کی مدح میں ایک قصیدہ کہا وہ اسے صاحب کے پاس بھیجنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ سوچ کر نہیں بھیجا کہ صاحب اسے کسی طرح کا لالچ یا اظہار تمنا نہ سمجھ بیٹھیں۔[۱۳]

۲۔ سید رضی نے عفت کلام کا ہمیشہ خیال رکھا۔ آپ کے یہاں ہجویہ اشعار میں بھی برے ور کیک الفاظ نہیں ملتے... اشعار میں ہجو تو ہے لیکن ناپسندیدہ الفاظ نہیں ہیں۔[۱۴]

۳۔ باطنی پاکیزگی اور روحانی عظمت کی وجہ سے خلفاء کی پسند والی غزلیں نہیں کہیں، ہرزہ سرائی اور یاوہ گوئی سے آپ کا کلام ہمیشہ پاک رہا۔[۱۵] حالانکہ اس زمانہ میں کلام میں گستاخی اور آلودگی رائج تھی۔[۱۶]

۴۔ سید رضی نے اپنے اشعار میں حقیقت سے کام لیا ہے اس سلسلہ میں آپ کسی شخص یا منصب سے مرعوب نہیں ہوئے اسی وجہ سے آپ کا کلام تملق اور چاپلوسی سے دور ہے۔ ان ہی خصوصیتوں کی بنا پر آپ کے اشعار پابند مکتب، بامقصد اور مخصوص جہت

کے حامل ہیں۔

آپ کا دیوان چار جلدوں میں مدون ہوا۔[16]

دوسروں کے بالمقابل آپ کے اشعار زیادہ بھی ہیں اور فصاحت و بلاغت کا اعلی معیار بھی ان میں پایا جاتا ہے، جن شعراء نے اچھے کلام کہے ہیں ان کے کلام بہت کم ہیں اور جنہوں نے زیادہ اشعار کہے ہیں ان کے یہاں کلام میں بلندی نہیں پائی جاتی زیادہ بھی اور اعلی معیار کا بھی کلام ہو یہ تو صرف سید رضی کا حصہ ہے ۔[17]

پیغام عاشورہ :

سید رضی، سید الشہداء کے فدائی اور مقصد حسین کے شیدائی تھے آپ نے سرزمین کربلا کا بارہا سفر کیا۔ ہر سال عاشورہ کا دن غم واندوہ کے ساتھ مناتے اور امام حسین کی بارگاہ میں اشکوں کا نذرانہ پیش کرتے تھے۔

آپ کے دیوان میں جو قصائد موجود ہیں وہ امامت سے عشق اور حریم ولایت کی پاسبانی کے مصمم ارادہ کا پتہ دیتے ہیں۔

نمونۂ کلام:

فرزند فاطمہ کو لے جانے کے بعد اب موت کو کس عزیز کے لے جانے کا خوف ہو سکتا ہے؟

ہولناک حادثہ اور دردناک واقعہ کے لئے کس دن آنکھیں اشکبار ہیں؟

حسین کے عاشور کا دن نہ بلانے والے دوستوں نے وفا کی اور نہ میزبان نے پناہ دی۔

اے فرزند فاطمہ ان لوگوں نے عہد کیا اور عہد کو توڑ دیا۔ وفادار کتنے کم ہیں۔

دوسری جگہ کہتے ہیں:

اے امیہ کی اولاد! جن بہادروں کے عزیز دور دراز کے علاقہ میں خاک وخون میں غلطاں ہو گئے ان کی تلواریں خواب غفلت میں نہیں پڑی رہیں گی۔

۔ شمشیر اپنی نیام میں بے قرار ہے۔ تیز رفتار گھوڑے میدان مشق میں بیتاب ہیں۔ اور میں اسی دن کے انتظار میں بیٹھا ہوں جب وہ تلوار بے جھجک آئے گی اور ان فریب خوردہ افراد کے جسم میں لرزہ پیدا کردے گی۔

ایک جگہ فرماتے ہیں:

اے حسین کے عاشور تیرے جاں سوز شعلہ نے میرے تار و پود جلا دیئے

میں ہر سال خاموش رہنا چاہتا ہوں مگر ہر سال میرے دل میں غم اندوہ بھر دیتا ہے

۔ اے جد والا تبار، سیاہ غم و حسرت ہمیشہ میرے دل پر حملہ کرتے ہیں۔

۔ سیلاب اشک رواں ہے اگر شب میں آنسو تھم بھی جائیں تو صبح پھر رواں ہو جاتے ہیں۔

۔ مدح وثناء کے ذریعہ میں آپ کی منزلت کیسے بڑھا سکتا ہوں آپ کو ہساروں پر جلوہ فرما ہیں اور ہم ٹیلوں پر ہیں۔

۔ ان ستاروں کی مدح ہم کیسے کریں جو طاق آسمان پر کہکشاں کے ہم پلہ ہیں۔

۔ جو آفتاب اپنی روشنی اور جلال کے ساتھ چمک رہا ہے وہ ہماری تعریف سے بے نیاز ہے۔

سید رضی کا ایک اور عاشور نامہ:

اس وقت خلافت اسلامی اپنے راستہ سے منحرف ہے اب امت کے رشد و صلاح کی امید نہیں کرنی چاہئے۔

۔ منبر خلافت ظالموں کے قبضہ میں ہے بنی امیہ کے بھیڑیئے اس پر اچھل رہے ہیں۔

۔ خلافت ان برگزیدگان الٰہی سے مخصوص ہے جنہیں اللہ نے الہام عطا کیا اور دین و آئین کا کفیل بنایا ہے۔[۱۸]

دیوان سید رضی کے اس حصہ کو ثقافت عاشورہ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ آپ نے اس حصہ میں ایثار، قربانی، جاں بازی، شجاعت اور عشق و محبت کو مجسم کر دیا ہے۔

غدیریہ:

غدیر خم کے واقعہ کی تحقیق کے لئے طویل گفتگو اور متعدد کتابیں لکھنے کی ضرورت ہوگی کیونکہ ظہور اسلام اور بعثت پیغمبر اسلامؐ کے بعد تاریخ بشریت کا حساس ترین واقعہ یہی ہے۔

غدیر کے دن خدا کے حکم سے امامت کے عہدہ پر امیر المومنین علیؑ فائز ہونے کی وجہ سے پیغمبر کی عالمی رسالت درجہ کمال تک پہونچی اور اسلام کی بقا کا سامان مہیا ہوا۔

اس وجہ سے غدیر خم کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی اسلام کی۔ اسی وجہ سے علماء مصنفین، بڑے بڑے واقف کار مورخین نے اسی واقعہ کے مختلف پہلوؤں نیز امامت و ولایت کے مسئلہ کو موضوع بحث و تحقیق قرار دیا ہے۔ اپنی گفتگو اور تحریروں سے اسے اثبات کی منزلوں تک پہونچایا اور اس کی یاد کو زندہ رکھا ہے۔

فرض شناس عظیم شعراء نے اس سلسلہ میں اپنا حق ادا کیا۔ انہوں نے اس موضوع پر قصیدہ لکھ کر اس واقعہ کو حیات دوام عطا کی۔ ان کے قصائد ''غدیریہ'' کے نام سے صفحات تاریخ کی زینت ہیں۔ سید رضی نے بھی نظم ونثر میں اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ ہم یہاں ان کے غدیر کے کچھ اشعار کا ترجمہ پیش کررہے ہیں۔

۔ہم سے خوشیاں چھن گئی ہیں صرف روز غدیر آشتی کا دن تھا۔

۔یہ وہ پر افتخار دن ہے جب وصی رسول امیر المومنین بن گئے۔

۔اس وجہ سے دل کو ٹھنڈا کرو عشق کو معشوق کے حوالے کردو۔

۔غم واندوہ کی جڑیں کھود دو اور امید وخوشی کے پودے لگاؤ۔

۔مبارک باد اور مدح وثناء زبان پر تمہاری محبت کا نشان دل پر نمایاں ہے۔ یہ بالکل نیا ستایش نامہ ہے، باغ کے درختوں کی طرح خوش وخرم

نیک دل قصیدہ خواں کی طرف سے جو آب غدیر سے سیراب ہے۔19

نا وقت غروب:

پورا بغداد غم واندوہ کے ماحول میں ڈوبا ہوا تھا۔ لوگوں کی تجسس آمیز اور معنی خیز نگاہیں ان کے اضطراب کا پتہ دے رہی تھیں۔ ایک ایسا اتفاقی حادثہ پیش آیا تھا جس پر کوئی بھی یقین کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ کوئی ماننے کے لئے تیار نہیں تھا کہ اتنی جلدی غم انگیز اور جاں سوز حادثہ ہوجائے گا۔

لیکن سب کچھ ختم ہو چکا تھا اور تسلیم کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ہر شخص ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا شریف دنیا سے چلے گئے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ۔محرم ۴۰۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

علم وتقوی وسیاست کے عظیم ستون سید مرتضی، اپنے بھائی کی ناگہانی موت سے اتنا متاثر ہوئے کہ جنازہ کو دیکھنے کی تاب نہ رہی اور شدت حزن وغم سے آپ نے حرم کاظمین میں پناہ لی۔

سید رضی کے جنازہ کی تشیع میں بہت بڑا مجمع شامل ہوا۔۲۰ فخر الملک وزیر نے نماز جنازہ پڑھی پہلے آپ کا جنازہ آپ کے گھر میں مسجد انبار کے پاس اور کرخ بغداد کے درمیان سپرد کیا گیا۔ بعد میں حرم سید الشھداء امام حسینؑ میں منتقل کیا گیا۔ اس کے بعد فخر الملکؒ سید مرتضی کو کاظمین سے واپس گھر لائے۔

سید رضی کے فراق کا مرثیہ:

بے شک سید رضی کے فراق کا غم سید مرتضی کے لئے بڑا سنگین تھا۔ آنسوں کے سیلاب میں آپ نے اپنے بھائی کا مرثیہ کہا۔

۔اے دوستو: اس حادثہ پر فریاد ہے جس نے میرے بازو شکستہ کر دئے۔ کاش میری جان بھی چلی جاتی۔

۔میں ہمیشہ خوف زدہ اور متفکر تھا۔ یہاں تک کہ یہ موقع آگیا اور مصیبت اٹھانا پڑی۔

۔میں نے بہت گزارش کی اور مہلت مانگی لیکن میری حالت زار پر رحم نہیں کیا گیا اور یہ مصیبت آپڑی۔

خدایا یہ کوتاہ مگر تابناک عمر! کتنی عمریں ایسی بھی ہیں جو بہت بڑی ہیں مگر ناپاک ہیں۔۲۳

حواشی:

۱۔استاد عبد العزیز طباطبائی کے ذریعہ یہ تمام مشخصات لکھے گئے ہیں یادنامہ سید رضی ۳۹۹۔۳۷

۲۔''کنگرہ ہزارہ نہج البلاغہ'' تاریخ ۶۰/۲/۲۷ میں شرکت کرنے والوں کے نام امام خمینی کا پیغام (صحیفہ نور ج ۱۴ص ۲۲۳)

۳۔ کلام جاودانہ ص/۱۶۵،۱۶۱

۴۔ الامام علی صوت العدالۃ الانسانیۃ" ج/۵ ص/۱۰۹۰ منقول از کلام جاودانہ

۵۔ کلام جاودانہ ص/۲۵۱

۶۔ علی و اعلامیہ جہانی حقوق بشر۔ ج/۳ ص/۱۵۱،۱۴۹

۷۔ رمضان و تاریخ ص/۲۷۹

۸۔ مقدمہ شرح نہج البلاغہ ابن الحدید ج/۱ ص/۳۲۔۳۱

۹۔ وفیات الاعیان ج/۴ ص/۴۸،۴۴

۱۰۔ عربستان سعودی میں ایک کوہستانی علاقہ ہے جس کے شمال میں عراق اور ملک اردن جنوب میں ربع خالی مشرق میں احساء، مغرب میں حجاز واقع ہے سعودی عربیہ کا پایہ تخت اسی علاقہ میں واقع ہے (فرہنگ معین ج/۶ ص/۲۱۰۷)

۱۱۔ سید رضی مولف نہج البلاغہ ص/۲۳۔۲۲

۱۲۔ زبان و نگارش فارسی ص/۱۴۵

۱۳۔ شذرات الذھب ج/۳ ص/۱۱۳

۱۴ و ۱۵۔ یادنامہ علامہ شریف رضی ص ۹۔۳۸۸

۱۶۔ العبر فی خبر من غبر، ج/۲ ص/۲۱۳

۱۷۔ تاریخ بغداد، ج/۲ ص ۲۴۶

۱۸۔ ترجمہ الغدیر، ج/۷

۱۹۔ ترجمۃ الغدیر، ج/۷

۲۰۔ الکامل فی التاریخ، ج/۹ ص ۲۶۱

۲۱۔ اعیان الشیعہ، ج/۹ ص/۲۱۷

۲۲۔ المنتظم، ج/۷ ص/۲۸۳

۲۳۔ ترجمۃ الغدیر، ج/۷ ص/۳۳۱



غربت زدہ ہو جاتے ہیں تو مایوس و سست ہو جاتے ہیں۔ عمل میں کوتاہی کرتے ہیں اور سوال میں مبالغہ کرتے ہیں خواہش نفس سامنے آجاتی ہے تو معصیت فوراً کر لیتے ہیں اور توبہ کو ٹال دیتے ہیں۔ کوئی مصیبت لاحق ہو جاتی ہے تو اسلامی جماعت سے الگ ہو جاتے ہیں۔ عبرت ناک واقعات بیان کرتے ہیں لیکن خود عبرت حاصل نہیں کرتے ہیں۔ موعظہ میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں لیکن خود نصیحت نہیں حاصل کرتے ہیں۔ قول میں ہمیشہ اونچے رہتے ہیں اور عمل میں ہمیشہ کمزور رہتے ہیں۔ فنا ہونے والی چیزوں میں مقابلہ کرتے ہیں اور باقی رہ جانے والی چیزوں میں سہل انگاری سے کام لیتے ہیں۔ واقعی فائدہ کو نقصان سمجھتے ہیں اور حقیقی نقصان کو فائدہ تصور کرتے ہیں۔

موت سے ڈرتے ہیں لیکن وقت نکل جانے سے پہلے عمل کی طرف سبقت نہیں کرتے ہیں۔ دوسروں کی اس معصیت کو بھی عظیم تصور کرتے ہیں جس سے بڑی معصیت کو اپنے لئے معمولی تصور کرتے ہیں اور اپنی معمولی اطاعت کو بھی کثیر شمار کرتے ہیں جب کہ دوسرے کی کثیر اطاعت کو بھی حقیر ہی سمجھتے ہیں۔ لوگوں پر طعنہ زن رہتے ہیں اور اپنے معاملہ میں نرم و نازک رہتے ہیں۔ مال داروں کے ساتھ لہو ولعب کو فقیروں کے ساتھ بیٹھ کر ذکر خدا سے زیادہ دوست رکھتے ہیں۔ اپنے حق میں دوسروں کے خلاف فیصلہ کر دیتے ہیں اور دوسروں کے حق میں اپنے خلاف فیصلہ نہیں کر سکتے ہیں۔ دوسروں کو ہدایت دیتے ہیں اور اپنے نفس کو گمراہ کرتے ہیں۔ خود ان کی اطاعت کی جاتی ہے اور یہ خود معصیت کرتے ہیں اپنے حق کو پورا پورا لے لیتے ہیں اور دوسروں کے حق کو ادا نہیں کرتے ہیں۔ پروردگار کو چھوڑ کر مخلوقات سے خوف کھاتے ہیں اور مخلوقات کے بارے میں پروردگار سے خوفزدہ نہیں ہوتے ہیں۔

(نہج البلاغہ رحکمت ۱۵۰)

تبلیغ بھی ان ہی سوروں کے لیے کیا ہے۔
کتابت وحی کے ذمہ دار، آیتوں کو نزول کی ترتیب کے لحاظ سے یکے بعد دیگرے تحریر کرتے تھے جب کبھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی آیت نازل ہوتی تھی تو پیغمبر اسلامؐ اور کاتبان وحی سمجھ جاتے تھے کہ اب نیا سورہ شروع ہو رہا ہے۔
امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث ہے:

کان یعرف انقضاء سورة بنزول بسم الله الرحمن الرحیم ابتداء لاخریٰ (۱)

دوسرے سورہ کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے نزول سے پہلے سورہ کے اختتام کا پتہ چلتا تھا:
ابن عباس کا بیان ہے کہ ''جب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی آیت نازل ہوتی تھی تو رسول خداؐ یہ سمجھ لیتے تھے کہ سورہ مکمل ہو چکا ہے اور اب نئے سورہ کا آغاز ہو رہا ہے (۲)
اس طرح قرآن مجید کی آیتیں نزول کی ترتیب کے ساتھ سوروں کی شکل میں تحریر کی گئیں۔ مکی آیتیں، مکی سوروں میں اور مدنی آیتیں مدنی سوروں میں شامل کی گئیں۔ اگر چہ یہ ممکن تھا کہ کسی سورہ کے مکمل ہونے میں کافی طویل عرصہ گزر جائے کیوں کہ سوروں کی آیتیں ایک ساتھ نازل نہیں ہوتی تھیں بلکہ تدریجاً نازل ہوتی تھیں۔
(ب) پیغمبر کے حکم سے، ترتیب نزول کے بغیر، کتابت: ''عناوین قرآن'' سے مربوط مقالہ میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کی ایک صفت ''متشابہ'' ہے۔ یعنی قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتوں کے درمیان مکمل ہماہنگی پائی جاتی ہے۔ یہی چیز، قرآن مجید کی ایک دوسری طرح سے کتابت کی دلیل بن سکتی ہے۔ تاریخی دستاویزوں کی روشنی میں یہ مسلم ہے کہ کبھی جب ایک آیت یا کچھ آیتیں نازل ہوتی تھیں تو پیغمبر اسلام ان آیتوں کو اس سورہ کے درمیان شامل کرنے کا حکم دیتے تھے جو پہلے مکمل ہو چکا ہے۔ اس طرح کی تدوین و کتابت کے لئے جو نزول آیات کے فطری طریقہ سے ہٹ کر ہے یہ

۱۔ التمہید، جلد ۱، ص ۲۱۲
۲۔ التمہید جلد ۱، ص ۲۱۲۔ المیزان جلد ۱۲، ص ۱۲۷، ۱۲۸

QURATERLY PAIGHAM-E-SAQLAIN, NEW DELHI
Registered with the Registrar of News Papers No. 57187/93
Ahle-e-Bait Cultural Complex, Shaheen Bagh, Jamia Nagar
New Delhi-25 TEL.: 26945462, 26945298

Vol. 8, Issue-2, Aug,Sep,Oct. 2005

راہِ حسینؑ

...صدر اسلام سے آج تک دو راستے رہے ہیں ایک آرام پرستوں کا راستہ جن کی زندگی کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ کہیں سے روزی روٹی حاصل کر کے پیٹ بھریں اور سو رہیں۔ اگر مسلمان ہیں تو اللہ کی عبادت بھی کر لیں لیکن ان کی نظر میں عیش و آرام ہر چیز پر مقدم ہے۔ صدر اسلام میں ایسے افراد موجود تھے۔ جس وقت حضرت سید الشہداؑ اپنا عظیم سفر شروع کر رہے تھے تو ان ہی آرام پسندوں میں سے کچھ نے آپؑ کو نصیحت کی تھی کہ آپ کیوں جا رہے ہیں آرام سے چپ چاپ بیٹھے رہئے... ہماری اسلامی تحریک کی ابتدا ہی سے ہمارے سامنے کچھ ایسے افراد تھے جو اپنے عیش و آرام کو ہر چیز پر مقدم سمجھتے تھے۔ ان کی نظر میں شرعی ذمہ داری بس اتنی ہے کہ نماز پڑھ لیں روزہ رکھ لیں اور اپنے گھر میں بیٹھے اللہ اللہ کرتے رہیں... ان لوگوں نے اسلام کو صرف نماز و روزہ جیسی عبادتوں میں محدود کر دیا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام کے بقول انھیں جانوروں کی طرح صرف اپنے چارہ کی فکر ہوتی ہے کہ کسی طرح سے ان کا پیٹ بھر جائے اور ان کی شہوت کی تسکین کا انتظام ہو جائے...

ایک دوسرا راستہ بھی رہا ہے جو انبیاء و اولیاء عظام کا راستہ ہے وہ اپنی تمام عمر ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھانے میں صرف کر دیتے تھے۔ انبیاء کرام، رسول خداؐ اور ائمہ طاہرین کے حالات زندگی سے واقف انسان، جانتا ہے کہ یہ ہستیاں اپنے مشن کے آغاز ہی سے جنگ و دفاع کی حالت میں تھیں۔ امیر المومنینؑ کی زندگی بھی ایسی ہی تھی آپ ہمیشہ الٰہی قوانین کی راہ میں جہاد فرماتے رہے۔ تمام ائمہ علیہم السلام ایسے ہی تھے البتہ حضرت سید الشہداؑ کو سب سے نمایاں مقام حاصل ہے۔

اگر سید الشہداؑ کا طرز فکر اپنے زمانہ کے مقدس مآبوں جیسا ہوتا ــ جن کا منصوبہ تھا کہ رسول خداؐ کے جوار میں خاموش بیٹھ کر عبادت کرتے رہیں ــ تو کربلا وجود میں نہ آتی۔ (امام خمینی ـ [illegible])

ضروری تھا کہ پیغمبر اسلام خود اس کی جگہ معین کریں اور اسی جگہ پر اسے اضافہ کرنے کا حکم دیں۔ ترتیب نزول سے ہٹ کر کسی سورہ میں مذکورہ آیتوں کو اضافہ کرنے میں یقیناً کوئی مصلحت رہی ہوگی جس سے آنحضرتؐ واقف تھے۔

ابن عباس کا بیان ہے کہ: ''پیغمبر خدا پر ایک زمانہ گزرتا تھا اور آپ پر کئی سورے نازل ہوتے تھے۔ جب کچھ آیتیں آپ پر نازل ہوتی تھیں تو آپ بعض کاتبوں کو طلب فرماتے اور ان سے کہتے تھے کہ ان آیتوں کو اس سورہ میں شامل کر دو جس کی یہ خصوصیات ہیں'' (۱)

ابن عباس ہی سے یہ روایت بھی ہے کہ پیغمبر پر نازل ہونے والی آخری آیت واتقوا یوما ترجعون فیه الی الله تھی، جبرئیل نے پیغمبرؐ سے کہا کہ آپ اسے سورہ بقرہ کی ۲۸۰ ویں آیت قرار دیں۔ (۲)

البتہ یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ آیتوں کی اس قسم کی تدوین و کتابت کا تذکرہ تاریخی دستاویزوں میں بہت کم ملتا ہے۔ اکثر آیتیں نزول کی فطری ترتیب ہی سے تدوین کی گئی ہیں۔ ان آیتوں کا ایک نمونہ اور ملاحظہ ہو:

''عثمان بن ابی عاص ناقل ہیں کہ: میں پیغمبر اسلام کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا کہ جبرئیل نازل ہو گئے۔ پیغمبر نے فرمایا کہ جبرئیل نے مجھ سے ان الله یأمر بالعدل والاحسان و ایتاء ذی القربی کو سورہ نحل میں اس جگہ پر رکھنے کو کہا ہے۔ اور یہ آیت سورہ نحل میں آیات استشہاد اور آیات عہد کے درمیان اضافہ کی گئی۔'' (۳)

ج۔ ترتیب نزول کی رعایت کے بغیر صحابہ کے اجتہاد سے کتابت: قرآن کریم کے بعض سوروں میں آیتوں کی ترتیب و تنظیم کا عمل، نزول کی قدرتی ترتیب کے مطابق انجام نہیں پایا ہے اور ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل بھی نہیں ہے جس سے یہ پتہ چل سکے

۱۔ البرہان جلد ۱ ص ۲۴۲، الاتقان جلد ۱ ص ۶۰ ۔ ۲۔ مجمع البیان جلد ۲ ص ۳۹۴
۳۔ البرہان جلد ۱ ص ۲۴۱، الاتقان جلد ۱ ص ۶۰

کہ نزول کی قدرتی ترتیب کی خلاف ورزی رسول خداؐ کے حکم سے کی گئی۔

علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں ایسا ہی ایک سورہ، سورۂ ممتحنہ کو قرار دیا ہے اس سورہ کے شروع کی نو آیتیں ۸ھ میں حاطب بن ابی بلتعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں (۱) ان آیتوں کے بعد دو آیتیں اور ہیں جو ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد سبیعہ اسلمیہ یا کلثوم بنت عقبہ نام کی ایک عورت کے بھاگ جانے کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے (۲) بارہویں آیت ۹ھ میں عورتوں کی بیعت کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے۔ (۳) اس سورہ کی آخری آیت اس کی ابتدائی آیتوں سے مضمون و مفہوم کے لحاظ سے مکمل مطابقت و مماثلت رکھتی ہے۔ (۴)

آیتوں کی ترتیب، توقیفی ہے؟

قرآن کریم کی آیتوں کی کتابت کے طریقہ کار کی گفتگو سے یہ دو بنیادی سوالات سامنے آئے ہیں جن کا جواب، یکساں نہیں دیا گیا ہے (کیا ہر سورہ میں آیتوں کی ترتیب

۱۔ حاطب بن بلتعہ اسلام لانے کے بعد ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے تھے لیکن ان کی بیوی مکہ ہی میں رہ گئی تھیں۔ قریش کو پیغمبر اسلام کی طرف سے جنگ چھیڑنے کا اندیشہ تھا چنانچہ انھوں نے حاطب کی بیوی سے کہا کہ وہ اپنے شوہر کو خط لکھ کر ان سے اس سلسلہ میں معلومات حاصل کریں۔ حاطب کی بیوی نے خط لکھا اور حاطب نے بھی خط کے جواب میں یہ لکھا کہ پیغمبر اسلامؐ جنگ کا ارادہ رکھتے ہیں۔ حاطب نے یہ خط صفیہ نامی ایک عورت کے ذریعہ روانہ کیا۔ صفیہ خط کو اپنے بالوں میں چھپا کر مکہ کی طرف چل پڑی۔ اسی وقت جبرئیل نے نازل ہو کر پیغمبر کو اس کی اطلاع دے دی۔ آپؐ نے حضرت علی اور زبیر بن عوام کو اس عورت کو تلاش کرنے کے لیے بھیجا۔ جب وہ عورت مل گئی تو امیر المومنین نے فرمایا وہ خط کہاں ہے۔ عورت نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس کی تلاشی لی گئی مگر کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ زبیر نے کہا اس کے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ حضرت علی نے فرمایا خدا کی قسم، خدا کے رسول نے ہم سے جھوٹ نہیں کہا ہے۔ اس کے بعد آپ نے اس عورت سے کہا سیدھے سے خط دے دو ورنہ خدا کی قسم میں تمہارا سر قلم کر کے رسول خدا کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ عورت نے وہ خط حضرت علی کے سپرد کر دیا اور آپ نے اسے رسول خدا کی خدمت میں پیش کر دیا۔ پیغمبرؐ نے حاطب سے دریافت کیا یہ کیا ماجرا ہے؟ اس نے قسم کھائی کہ میں منافق نہیں ہوں چونکہ قریش نے میری بیوی کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا ہے لہٰذا میں نے انھیں انعام دینے کی نیت سے یہ اقدام کیا ہے۔ اس وقت خداوند عالم نے یہ آیتیں نازل کیں (المیزان جلد ۱۹ ص ۲۳۵)

۲۔ سبیعہ اسلمیہ وہ مسلمان مہاجرہ ہے جو اپنے کافر شوہر کو مکہ میں چھوڑ کر مدینہ بھاگ آئی تھی اس کا شوہر بیوی کو واپس لے جانے کے لیے پیغمبر اسلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ صلح حدیبیہ کے بعد آنحضرت کی خدمت میں پہنچا تھا۔ آپؐ نے قریش سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ اگر قریش کی کوئی فرد بھاگ کر مسلمانوں کی پناہ میں آئے گی تو وہ اسے واپس لوٹا دیں گے۔ ایسے وقت میں یہ دونوں آیتیں نازل ہوئیں۔

۳۔ فتح مکہ کے وقت پیغمبر جب مردوں سے بیعت لے کر فارغ ہو گئے تو عورتیں بھی بیعت کرنے کے لیے آئیں اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۷۳)

۴۔ بحار الانوار جلد ۹۲ ص ۶۷ تا ۷۰، التمہید جلد ۱ ص ۲۱۳

توقیفی ہے یعنی پیغمبر کے حکم سے انجام پائی ہے یا صحابہ نے اپنے اجتہاد سے ترتیب دیا ہے؟

۲۔ قرآن کریم کے سوروں کی ترتیب توقیفی ہے یا اجتہادی؟ (۱)

قرآن کریم کی آیتوں کی کتابت کی کیفیت سے متعلق بحث کی شق الف اور ب سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ سورہ میں آیتوں کی ترتیب توقیفی ہے لیکن اسی بحث کی شق ج سے اس کے برخلاف نتیجہ نکلتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ سورۂ ممتحنہ جیسے سوروں کی آیتوں کو کس طرح سے ترتیب دیا گیا ہے؟ کیا تمام سوروں کی آیتوں کی ترتیب توقیفی ہے؟ کیا اکثر سوروں کی آیتوں کی ترتیب توقیفی اور چند سوروں میں آیتوں کی ترتیب اجتہادی ہے؟ کیا کچھ سوروں میں آیتوں کی ترتیب توقیفی کچھ سوروں میں اجتہادی ہے؟

ان سوالوں کا جواب اس لیے اہم ہے کہ تاریخ تدوین قرآن پیش کرنے میں یہ جواب بہت کارساز ہے قرآن مجید کے بہت سے محققوں اور مفسروں نے قرآن مجید کے توقیفی ہونے کو تسلیم کیا ہے۔

جلال الدین سیوطی کہتے ہیں: بے شمار حدیثوں اور اجماع سے آیتوں کی ترتیب کا توقیفی ہونا ثابت ہے۔ اور اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے (۲)

وہ اس سلسلہ میں چند حدیثوں سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں: (۳)

"جو حدیثیں آیتوں کی ترتیب کے توقیفی ہونے پر دلالت کرتی ہیں ان میں سے وہ روایتیں بھی ہیں جو مختلف مقامات اور مختلف اوقات میں پیغمبر اسلام کے ذریعہ مختلف سوروں کی قرائت کو نقل کرتی ہیں۔ مثلاً صحیح بخاری میں ہے کہ پیغمبر اکرم نماز مغرب میں سورۂ اعراف کی تلاوت کرتے تھے اور جمعہ کے دن صبح کی نماز میں سورۂ ھل اتی علی الانسان اور قم تنزیل" کی تلاوت فرماتے تھے (۴) قاضی ابوبکر باقلانی نے کتاب انتصار میں لکھا ہے:

" آیتوں کی ترتیب واجب حکم اور لازمی فرمان ہے جبرئیل بتاتے تھے کہ فلاں

۱۔ اس سوال کا جواب بعد کے شمارے میں دیا جائے گا۔

۲۔ الاتقان، جلد ا، ص ۱۸۹، طبع ۱

۳۔ الاتقان، جلد ا، ص ۱۷۲

۴۔ یہ حدیثیں قرائت کی بحث میں شق ب میں درج کی جا چکی ہیں۔

آیت فلاں جگہ پر رکھی جائے''

ان کا نظریہ ہے کہ سوروں میں کون سی آیت کہاں رکھی جائے گی اس ترتیب کے سلسلہ میں امت، پیغمبر اسلام کے حکم کا اتباع کرتی تھی۔ اسی طرح سے قرائت، پیغمبر سے سیکھتی تھی۔

مکی اور کچھ دوسرے محققوں نے کہا ہے کہ:

''سوروں میں آیتوں کی ترتیب کا عمل آنحضرتؐ کے حکم کے مطابق انجام پاتا تھا۔ چونکہ آنحضرتؐ نے سورۂ برائت کے شروع میں بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھنے کا حکم نہیں دیا اس لیے یہ سورہ، بسم اللہ کے بغیر ہی رہ گیا (۱)

ابن حصار کا نظریہ ہے کہ آیتوں کو موجودہ مقام پر صرف اور صرف وحی کے اشارہ پر رکھا گیا ہے۔ خود آنحضرتؐ یہ بتایا کرتے تھے کہ کون سی آیت کس سورہ میں اور کہاں پر رکھی جائے گی۔ اور متواتر روایتوں سے یہ ثابت ہے کہ آنحضرت جب سوروں کی تلاوت فرماتے تھے تو اسی موجودہ ترتیب کے مطابق تلاوت فرماتے تھے اس سے یہ یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ آیتوں کی ترتیب آنحضرت کی منشاء کے مطابق اور ان ہی کے حکم سے انجام پائی ہے (۲)

بیہقی کا بھی یہی نظریہ ہے (۳)

زرکشی نے آیتوں کی ترتیب کے توقیفی ہونے پر ایک دوسری دلیل پیش کی ہے:

''اصحاب نے جس طرح سے پیغمبرؐ سے قرآن سنا تھا اسی شکل میں اسے لکھ لیا۔ کسی آیت کو مقدم کیا نہ مؤخر، صحابہ کا کام قرآن مجید کو ایک جگہ پر اکٹھا کر دینا تھا اس کی ترتیب و تنظیم میں ان کا کوئی دخل نہیں تھا۔ کیوں کہ قرآن مجید، لوح میں اسی شکل میں لکھا ہوا تھا جس شکل میں آج ہمارے پاس موجود ہے۔ خداوند عالم نے اسے ایک مرتبہ مکمل شکل میں آسمانِ دنیا پر نازل کیا (ماہ رمضان اور شب قدر میں نزول قرآن سے متعلق آیتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے) پھر رفتہ رفتہ متفرق طور پر آنحضرتؐ پر ۲۳ سال کے دوران نازل ہوتا رہا۔ (۴)

۱۔ الاتقان جلد ص ۱۹۳ — ۲۔ الاتقان جلد ص ۱۹۴

۳۔ ا۔ الاتقان جلد ص ۱۹۵ — ۴۔ البرہان جلد ۱ ص ۲۳۱

زرکشی، ابوالحسین بن فارس (احمد ابن فارس بن زکریا) سے بھی نقل کرتے ہیں کہ سوروں میں تمام آیتوں کی ترتیب توقیفی ہے اور پیغمبر خود بنفس نفیس ان آیتوں کو ترتیب دینے کے ذمہ دار تھے (۱)

لیکن کیا حقیقت یہی ہے؟ قرآن مجید کے تمام سوروں میں تمام آیتوں کی ترتیب واقعاً توقیفی ہے؟

اگر واقعاً ایسا ہی ہے تو تمام مکی آیتوں کو مکی سوروں میں اور تمام مدنی آیتوں کو مدنی سوروں میں ہونا چاہیے سیوطی اور زرکشی جیسے اس توقیفی نظریہ کے طرفداروں نے تفصیل سے آیات مستثنیات (مدنی سوروں میں مکی آیتوں اور مکی سوروں میں مدنی آیتوں کے وجود) کے بارہ میں گفتگو کی ہے اور اس کے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ اگر کوئی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ بعض اوقات پیغمبر اسلامؐ خود ہی اس ترتیب کو تبدیل کر دیتے تھے اور یہ ترتیب کے توقیفی ہونے سے منافات نہیں رکھتا تو اس کا جواب واضح ہے: ہم اس سے پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ صرف گنے چنے چند مقامات ایسے ہیں جہاں پیغمبر نے ترتیب کو بدل کر کسی آیت کو پہلے سے مکمل شدہ سورہ میں اضافہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ جو لوگ تمام آیتوں کی ترتیب کے توقیفی ہونے کے قائل ہیں ان میں سے اکثر لوگوں نے ان ہی چند موارد کو دلیل بنایا ہے۔ ان لوگوں نے عثمان ابن ابی العاص یا ابن عباس سے نقل ہونے والی ایک روایت کی بناء پر قرآن مجید کی تمام آیتوں کے لیے ایک کلی حکم صادر کر دیا جبکہ ان راویوں نے صرف ایک آیت کی جگہ پیغمبر اسلامؐ کے ذریعہ معین کرنے کی بات نقل کی ہے۔

جلال الدین سیوطی نے تمام آیتوں کے توقیفی ہونے کے سلسلہ میں جو استدلال پیش کیا ہے وہ بھی کامل نہیں ہے۔ کیوں کہ مختلف اوقات مختلف مقامات پر سوروں کی قرآئت کی پیغمبر اسلام کی طرف نسبت کو دلیل قرار دینا صحیح نہیں ہے کیوں کہ اولاً یہ قرائت تمام سوروں کے سلسلہ میں ثابت نہیں ہے ثانیاً گفتگو آیتوں کی ترتیب و تنظیم کے بارہ میں ہے قرائت کے سلسلہ میں نہیں۔ قرآن کی آیتوں کی تدوین کا کام پیغمبرؐ کی حیات میں بھی ہوا ہے اور آپ کی رحلت کے بعد بھی۔ آنحضرتؐ کے کسی سورہ کی قرائت و تلاوت کا یہ مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اب کوئی شخص سوروں میں آیتوں کو آگے پیچھے کر ہی نہیں سکتا۔

زرکشی کا استدلال تو اس سے بھی زیادہ عجیب ہے کیوں کہ شیعہ و سنی ذرائع سے آسمانِ چہارم

(۱) البرہان جلد ۱ ص ۲۳۱

یا آسمان دنیا پر لوح محفوظ سے قرآن کے نازل ہونے کے متعلق نقل ہونے والی روایتیں یہ ہرگز نہیں بتاتیں کہ لوح محفوظ میں بھی قرآن اسی موجودہ ترتیب کے ساتھ لکھا ہوا تھا۔ ان روایتوں کا کتابت سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ قرآن مجید کی تمام آیتوں کی ترتیب کے توقیفی ہونے کے نظریہ کا دفاع نہیں کیا جا سکتا لہٰذا مجبوراً ہمیں دوسرے سوال کا رخ کرنا پڑے گا۔

کتاب التمہید کے مصنف کا نظریہ ہے کہ قرآن مجید کے چند سوروں میں آیتوں کی ترتیب، نزول کے مطابق نہیں ہے اور کوئی خاص حدیث بھی ہماری نظر میں نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ فطری ترتیب سے انحراف پیغمبر اسلامؐ کے حکم سے انجام پایا ہے لہٰذا ہم ان سوروں میں آیتوں کی ترتیب کو توقیفی نہ ماننے پر مجبور ہیں۔ (۱)

علامہ طباطبائی باوجودیکہ اکثر سوروں میں آیتوں کی ترتیب کو توقیفی مانتے ہیں تاہم وہ ایسے سوروں کی تعداد بھی کم نہیں مانتے جن میں صحابہ نے اپنی رائے اور اجتہاد سے آیتوں کو ترتیب دیا ہے۔ علامہ طباطبائی کا نظریہ ہے کہ متفرق و پراگندہ شکل میں نازل ہونے والی آیتیں آج سوروں میں جہاں موجود ہیں اس کی ترتیب میں اصحاب کے اجتہاد کی مداخلت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ حقیقت خلیفہ اول کے زمانہ میں قرآن مجید کی جمع آوری کے سلسلہ کی روایتوں سے بخوبی آشکار ہو جاتی ہے۔

علامہ طباطبائی، سوروں کی آیتوں کی ترتیب کے سلسلہ میں شیعہ و سنی ذرائع سے نقل ہونے والی روایتوں کے ذریعہ — جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمین آیتوں کو نزول کی ترتیب سے لکھتے تھے اور جب بھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی آیت نازل ہوتی تھی۔ تو سب لوگ سمجھ جاتے تھے کہ یہ سورہ ختم ہو چکا ہے اور اب دوسرا سورہ شروع ہو رہا ہے — استدلال فرماتے ہیں کہ یہ روایتیں صاف لفظوں میں یہ بتا رہی ہیں کہ پیغمبر کے سامنے قرآن مجید کی آیتیں نزول کی ترتیب سے اکٹھا کی گئی تھیں کی آیتیں مکی سوروں میں اور مدنی آیتیں مدنی سوروں میں تھیں۔ اگر آج ہمیں آیتوں کی جگہیں بدلی ہوئی نظر آ رہی ہیں تو اس کا تعلق صحابہ کے اجتہاد سے ہے اسباب نزول سے متعلق بہت سی روایتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آج مدنی سوروں میں بہت سی ایسی آیتیں ہیں جو مکہ میں نازل ہوئی ہیں اور ایسی بھی آیتیں ہیں جو آنحضرت کی زندگی کے آخری ایام میں نازل ہوئی ہیں لیکن انھیں ان سوروں میں جگہ دی گئی ہے جو آنحضرت کی ہجرت کے ابتدائی ایام میں نازل ہوئی ہیں (۲)

۱۔ التمہید جلد ۱ ص ۲۱۳ ۲۔ المیزان جلد ۱۲ ص ۱۲۷، ۱۲۸

المیزان سے نقل شدہ بیان کے مطابق علامہ کا نظریہ ہے کہ قرآن مجید کی جمع آوری کا جو کام آنحضرت کی رحلت کے بعد ہوا ہے اس ترتیب میں کچھ آیتوں کی ترتیب توقیفی نہیں ہے لیکن آنحضرت کی حیات کے زمانہ میں جب آنحضرت کتابت، تدوین اور ترتیب کی خود ہی نگرانی فرماتے تھے اس وقت کی جمع آوری میں تمام آیتوں کی ترتیب توقیفی ہے(۱)

(۱) کتاب المیزان میں علامہ طباطبائی کے نظریہ کو قبول کر لینے کا نتیجہ اچھا نہیں برآمد ہوگا۔ کیوں کہ اولاً جب ہم پیغمبر کی زندگی میں قرآنی آیات کی ترتیب کا توقیفی ہونا تسلیم کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس ترتیب کی خلاف ورزی کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے۔ اب اگر آنحضرت کی رحلت کے بعد یہ ترتیب بدل جائے تو یقیناً قرآن مجید کی حفاظت و تقدس پر حرف آئے گا۔ سوروں کی ترتیب میں اس طرح کی الٹ پھیر اتنا زیادہ نقصان دہ نہیں ہے کیوں کہ قرآن مجید میں ہر سورہ اپنی جگہ ایک مستقل مجموعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم قرائت قرآن کے لیے مختلف سوروں کا انتخاب کر سکتے ہیں سوروں کا انتخاب اگر چہ ترتیب نزول کے برخلاف ہو اصل قرآن میں کوئی خلل واقع نہیں ہوگا۔ لیکن ایک سورہ کی آیتوں میں ترتیب کی یہ تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ ایک سورہ کی آیتیں آپس میں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں اور ایک متحدہ مجموعہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور وسیع پیمانہ پر ان کی ترتیب میں الٹ پھیر کا نتیجہ ایک طرح کی تحریف ہے۔

ثانیاً قرآن مجید کے اعجاز کا ایک اہم حصہ آیتوں کے نظم و ترتیب سے تعلق رکھتا ہے۔ جب قرآن ایک سورہ کا بھی جواب لانے کا چیلنج کرتا ہے تو آیتوں کے درمیان پائی جانے والی ترتیب، تنظیم بھی مد نظر ہوتی ہے۔ ایک آیت میں الفاظ کی ترتیب جو کردار ادا کرتی ہے تقریباً وہی کردار ایک سورہ میں آیتوں کا نظم ادا کرتا ہے کسی قصیدہ کے حسن و لطافت کو ختم کرنے کے لیے اس کے کسی ایک مصرع کو بے جا کر دینا کافی ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں کسی قصیدہ سے کہیں زیادہ نظم و ترتیب کا خیال رکھا گیا ہے بلکہ ان دونوں کے درمیان موازنہ ہی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ آیتوں کی ترتیب میں کسی قسم کی تبدیلی اس کی بے نظمی اور عدم ہم آہنگی کو اجاگر کر دیتی ہے اور حافظان قرآن اسے فوراً محسوس کر لیتے ہیں۔

اگر مذکورہ نتائج سے بھی چشم پوشی کر لیں تو یہ نظریہ علامہ طباطبائی کے اپنے اصولوں سے میل نہیں کھاتا کیوں کہ علامہ طباطبائی نے جو آیات مستثنیات کی کثرت و وسعت کی بات کی ہے وہ ان بے شمار روایتوں کی بنیاد پر کی ہے جو اسباب نزول کے سلسلہ میں پائی جاتی ہیں (المیزان جلد ۱ص ۲۳) حالانکہ خود علامہ نے دیگر مقامات پر اسباب نزول سے متعلق روایتوں کو مشکوک قرار دیا ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ متعدد مصحف ترتیب دینے والوں کے درمیان سورہ میں آیتوں کی ترتیب میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ چاہے وہ افراد ہوں جنھوں نے رسول خدا کے زمانہ میں قرآن کو ترتیب دیا تھا اور چاہے وہ افراد جنھوں نے آنحضرت کی رحلت کے بعد ترتیب قرآن کا کام شروع کیا تھا۔ اصحاب کے مصحفوں میں اختلاف صرف سوروں کی ترتیب میں ہے یا سوروں کی تعداد میں۔ اگر آنحضرت کی رحلت کے بعد آیتوں کی ترتیب میں اصحاب نے اپنے اجتہاد کو دخل دیا ہوتا تو ان کے درمیان اس مسئلہ پر وسیع اختلاف پایا جاتا حالانکہ ایسا کوئی اختلاف سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ آیات مستثنیات کا کوئی اور علاج تلاش کرنا چاہیے۔ اصحاب کی رائے و اجتہاد سے انھیں جوڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اس نظریہ کی ایک اور مشکل مسلمانوں کے درمیان قرآن کریم کے حافظوں کی ایک بڑی تعداد ہے جن لوگوں نے آنحضرت کی زندگی میں سوروں کو حفظ کیا تھا اور قرائت قرآن کو ہمیشہ بہترین کام سمجھتے تھے کیا ان لوگوں کے ہوتے ہوئے پیغمبر اکرم کی ترتیب سے انحراف اور وہ بھی اتنے وسیع پیمانہ پر ممکن تھا؟

ہاں بس اتنا تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم کے چند سوروں میں آیتوں کی ترتیب توقیفی نہیں ہے۔ آنحضرت کی رحلت کے بعد قرآن کی جمع آوری کے وقت کچھ چند آیتوں کی ترتیب میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے۔

قرآن کریم کے حافظ اور جامع

ہم نے اس مقالہ کی ابتدا ہی میں یہ اشارہ کیا تھا کہ پیغمبر اکرمؐ اور آپ کے اصحاب، قرآن کریم کی کتابت اور حفظ کا بہت اہتمام کیا کرتے تھے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مکہ اور مدینہ میں آنحضرتؐ کی رسالت کے دور میں ان دونوں میدانوں میں قرآن کریم کو کس قدر ظاہری حمایت و پشتیبانی حاصل تھی۔

(الف) حافظان قرآن

اصحاب کے درمیان حافظوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ جنگ احد، بئر معونہ اور واقعہ یمامہ میں شہید ہونے والوں کی تعداد اس دعویٰ کا بہترین ثبوت ہے ۔ ۴ھ ماہ صفر میں ''بئر معونہ'' (۱) کا حادثہ پیش آیا ہے جس میں چالیس یا ستر صحابی شہید ہوئے۔ رسول خداؐ کی رحلت کے تقریباً ایک سال بعد یمامہ کا واقعہ رونما ہوا (۲) جس میں ایک ہزار یا ۱۲ سو مسلمان مارے گئے جس میں کم از کم ستر صحابہ وحافظان قرآن تھے۔ (۳)

ڈاکٹر رامیار، مہاجر وانصار میں موجود حافظان قرآن کی تعداد گنانے کے بعد لکھتے ہیں:

''ہمارے پاس عہد پیغمبرؐ کے ۲۷ حافظوں کا نام موجود ہے لیکن۔ یقیناً قاریوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے جن کی قرأت ہم تک نہیں پہنچ سکی ہے اور فراموش کر دیئے گئے ہیں'' (۴)

تمام حافظوں کا تذکرہ اور ان کا تعارف مقالہ کو کافی طویل بنا دے گا لہٰذا صرف

۱۔ جنگ احد کے چار مہینہ بعد قبیلۂ بنی عامر کے سردار کی دعوت پر چالیس اور ایک روایت کے مطابق ستر منتخب اصحاب جنھیں ''قراء'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا قبیلہ والوں کی تعلیم کے لیے وہاں بھیجے گئے۔ اس جماعت کے سربراہ ''منذر بن عمرؓ'' تھے جو اسلام سے پہلے بھی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ مکہ مدینہ کے درمیان میں پہاڑ پر پانی کا ایک ذخیرہ ہے جسے بئر معونہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جب یہ قافلہ اس جگہ پر پہنچا تو کافروں نے ان پر اچانک حملہ کر کے سب کو قتل کر دیا۔ پیغمبرؐ اس المیہ سے اتنا متاثر ہوئے کہ ایک ماہ تک نماز صبح کے قنوت میں ان قاتلوں پر نام بنام لعنت بھیجتے تھے (تاریخ قرآن از ڈاکٹر محمود رامیار ص ۲۳۰)

۲۔ اس کی تفصیل آئندہ شماروں میں بیان ہوگی۔

۳۔ تاریخ قرآن از ڈاکٹر رامیار ص ۲۵۳، البرہان جلد ۱ ص ۳۶

۴۔ تاریخ قرآن از ڈاکٹر رامیار ص ۲۵۵

مشہور ترین حافظوں کے نام کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں:

حضرت علی ابن ابی طالب ،عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب ، زید بن ثابت ، عثمان ، معاذ بن جبل، ابوالدرداء، ابوایوب ، سعد بن عبید اور ابوزید۔

(ب) جامعان قرآن

اگر چہ پیغمبر اسلام نے بعض لوگوں کو کتابت قرآن کی ذمہ داری سونپی تھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ دیگر اصحاب کو کتابت قرآن سے روک دیا گیا تھا اور وہ خود اپنے لیے قرآن مجید کے سوروں اور آیتوں کو نہ لکھیں۔

قتادہ نے انس بن مالک سے سوال کیا کہ من جمع القرآن علی عهد رسول الله ؟رسول خدا کے زمانہ میں قرآن کس نے جمع کیا؟ انھوں نے جواب دیا :اربعة کلهم من الانصار :ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت و ابو زید (۱) چار افراد نے اور ان سب کا تعلق انصار سے ہے ابی بن کعب ، معاذ بن جبل ، زید بن ثابت اور ابوزید۔

ایک اور روایت میں ہے کہ پیغمبر نے اس حال میں انتقال فرمایا کہ صرف چار افراد نے قرآن اکٹھا کیا تھا :ابوالدرداء ، معاذ بن جبل ، زید بن ثابت اور ابوزید (۲)

ابوعبداللہ زنجانی کہتے ہیں

کچھ اصحاب نے پیغمبر کی زندگی ہی میں پورا قرآن جمع کرلیا تھا اور کچھ نے قرآن کے بعض حصوں کو جمع کیا تھا لیکن آپ کی رحلت کے بعد اس کام کو پورا کرلیا۔ محمد بن اسحاق نے "الفہرست" میں رسول خدا کی زندگی ہی میں پورا قرآن جمع کر لینے والوں کے یہ نام ذکر کیے ہیں: علی بن ابی طالب ، سعد بن عبید بن نعمان بن عمرو بن زید ، ابو الدرداء ، (عویمر بن زید) معاذ بن جبل ، ابوزید بن ثابت بن زید بن نعمان ، ابی بن کعب بن قیس ، عبید بن معاویہ و زید بن ثابت" (۳)

۱۔ صحیح البخاری، جلد ۶ ص ۱۰۲

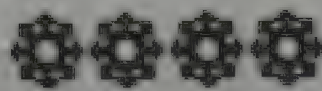
۲۔ بحار الانوار، جلد ۹۲ ص ۷۷

۳۔ تاریخ القرآن، ساتویں فصل ص ۳

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان روایتوں میں ''جمع'' سے مراد ''حفظ'' ہے کیوں کہ حافظان قرآن کو جماع قرآن بھی کہا جاتا تھا۔ اگر یہ بات صحیح بھی ہو پھر بھی ان روایتوں میں جمع سے مراد حفظ نہیں ہے۔ کیوں کہ جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا چکا ہے پیغمبر کی زندگی میں حافظوں اور قاریوں کی بہت بڑی تعداد تھی صرف یہی چند افراد نہیں تھے۔ اگر جمع سے مراد حفظ ہوتا تو حافظوں کو ان ہی چند افراد میں منحصر کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے بعض لوگوں کا تو خیال ہے کہ پورا قرآن لکھنے والوں کی تعداد بھی اس سے زیادہ تھی کیوں کہ روایتوں میں مصحف سے دیکھ کر قرآن مجید کی تلاوت کا شوق دلایا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرتؐ کے زمانہ میں قرآن مجید کے بہت سے مکتوب نسخے موجود تھے۔(۱)

حاکم، مستدرک میں لکھتے ہیں: قرآن تین مرتبہ اکٹھا کیا گیا ایک مرتبہ آنحضرتؐ کی زندگی میں۔(۲)

البتہ ایسی کوئی دلیل نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ قرآن جمع کرنے والوں نے آنحضرتؐ کی زندگی ہی میں قرآن مجید کے سوروں کو بھی ترتیب دے دیا تھا۔ یقین سے صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرت کی زندگی میں پورا قرآن لکھا جا چکا تھا اور تمام شواہد وقرائن یہی بتاتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے اس کا زبردست انتظام واہتمام فرمایا تھا۔



۱) حقائق هامة حول القرآن الكريم، ص۹۹،۱۰۰

۲) البرہان، جلد۱، ص۲۳۱۔ الاتقان، جلد۱، ص۱۸۱

(ص ۹ کا بقیہ)

تب بھی عمرانہ اپنے شوہر کے ساتھ کمافی السابق ازدواجی زندگی بسر کر سکتی ہے یہ تمام شیعہ فقہاء کا اجماعی فتویٰ ہے کہ اگر شادی کے بعد سسر اپنی بہو سے یا ساس اپنے داماد سے ناجائز رشتہ قائم کرلے تو بہو داماد کی ازدواجی زندگی متاثر نہ ہوگی۔ ہاں اگر شادی سے پہلے اس قسم کا کوئی ناجائز رشتہ قائم ہوتا ہے تو اس عورت سے زانی کا بیٹا یا اس مرد سے زانیہ کی بیٹی شادی نہیں کر سکتی۔ اس کی مؤید اہل بیت علیہم السلام کے ذریعہ نقل ہوئی دو حدیثیں ہیں:

۱۔ فی صحیح محمد بن مسلم عن أحدھما: "انه سئل عن الرجل یفجر بالمرأة أیتزوج بابنتها؟ قال: لا، ولکن ان کانت عنده امرأته ثم فجر بأمها او اختها لم تحرم علیه امرأته، ان الحرام لا یفسد الحلال (وسائل الشیعہ، مستمسک العروۃ)

امام محمد باقر یا امام جعفر صادق علیہما السلام سے اس شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جس نے کسی عورت سے زنا کیا ہے، کیا وہ اس کی بیٹی سے شادی کر سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں۔ لیکن اگر وہ کسی عورت سے پہلے شادی کر چکا ہے اور پھر اپنی ساس یا سالی سے زنا کرتا ہے تو اس پر اس کی بیوی حرام نہیں ہوگی" کیونکہ کوئی فعل حرام کسی حلال کو فاسد نہیں کر سکتا۔"

۲۔ صحیح زرارہ عن ابی جعفرؑ: انه قال فی رجل زنا بام امرأته او ببنتها او باختها فقال: لا یحرم ذلک علیه امرأته ثم قال: "ما حرم حرام حلالا قط"
(مستمسک العروۃ، وسائل الشیعہ)

امام باقرؑ نے اس شخص کے بارے جس نے اپنی ساس یا سوتیلی بیٹی یا سالی سے زنا کیا ہے فرمایا اس فعل زنا سے اس کے لئے اس کی بیوی حرام نہیں ہوگی" کیونکہ کبھی کوئی فعل حرام کسی حلال کو حرام نہیں بنا سکتا"۔

مذکورہ حدیثوں میں اگرچہ سسر بہو کے ناجائز تعلقات کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ صرف ساس داماد کے ناجائز رشتوں کا ذکر ہے لیکن مکمل مشابہت اور حدیث میں پیش کی گئی تعلیل کی روشنی میں یہ حکم عام ہے۔ شادی کے بعد چاہے سسر بہو اور چاہے ساس داماد کے درمیان شرمناک رشتہ قائم ہوا ہو مذکورہ میاں بیوی کے ازدواجی رشتہ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ البتہ زانی کو سزا ضرور ملے گی اگر زنا محصنہ ہے تو سنگسار کیا جائے گا ورنہ کوڑے لگائے جائیں گے بشرطیکہ اسلامی حکومت قائم ہو اور اس کے نفاذ کا امکان ہو۔ یہیں سے اسلامی حکومت کے قیام کی ضرورت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ فی الحال تو ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ اس دن کی امید میں۔ ✿

قرآنی قصّوں کا مقصد

جناب صالح قادری

قرانی قصوں میں گذشتہ قوموں کی سرگذشت ، نہایت دلچسپ ودلنشیں انداز میں بیان ہوئی ہے۔ ماضی میں رونما ہونے والے حادثات وواقعات پر بہت خوبصورت اسلوب میں روشنی ڈالی گئی ہے اور داستان کی شخصیتوں کی واضح تصویر پیش کی گئی ہے۔ لیکن تمام باتوں سے زیادہ اہم، یہ نکتہ ہے کہ قرآنی قصوں میں ''مقصد اور پیغام'' پر خصوصی توجہ دی گئی ہے اور کبھی بھی منظر کشی کے دوران قاری کو سرگرمی ووقت گزاری کا احساس نہیں ہوتا۔ شوکت الفاظ کا اہتمام اور قصہ گوئی کے فن کا بہترین استعمال کبھی بھی ''مقصد و پیغام'' کو ثانوی حیثیت اختیار کرنے نہیں دیتا۔ بلکہ قرآنی قصہ پڑھنے والے انبیاء کی زندگی کے نشیب وفراز سے واقفیت کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی بسر کرنے کے مشترک طور وطریقوں اور ان کے عقائد کی متحدہ بنیادوں سے بھی آگاہ ہو جاتے ہیں۔

قرآنی قصہ پڑھنے والے، گزشتہ قوموں کی شکست وکامیابی سے مطلع ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی شکست وکامیابی کے راز سے بھی آشنا ہو جاتے ہیں اور الٰہی اصول کا بھی انکشاف کر لیتے ہیں۔ اسی طرح داستان کی شخصیتوں کی خوش بختی وبدبختی سے باخبر ہو کر ان کے تجربات سے درس عبرت لیتے ہیں۔

نتیجہ میں پورے یقین ووثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ قرآنی کہانیاں مفید وثمر بخش مقاصد کی حامل ہیں اور اس کے اہم ترین مقاصد یہ ہیں:

درس عبرت، نمونہ عمل کی فراہمی، ایمانی جذبات کا استحکام، الٰہی سنتوں سے واقفیت،

الٰہی ادیان کے متحد و ہم آہنگ ہونے کی خبر، انسانی تاریخ کی صحیح معرفت، سب سے زیادہ اہم قرآن مجید کا وحی الٰہی ہونا سب پر آشکار کرنا ہے۔ اس مقالہ میں مذکورہ مقاصد پر مختصر لفظوں میں روشنی ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے:

۱۔ درس عبرت

قرآنی قصوں میں، گذشتہ اقوام و ملل کی سرگذشت، اس انداز سے بیان کی گئی ہے کہ قاری اپنی سرنوشت کو گذشتہ اقوام کی سرنوشت سے جدا تصور نہیں کر سکتا۔ بلکہ داستان کی منظر کشی کچھ اس طرح کی ہے کہ قاری ہر قدم پر خود کو کہانی کے ہمراہ تصور کرتا ہے اور تاریخ بشریت میں رونما ہونے والے حادثات و واقعات میں موجود پاتا ہے۔ گذشتہ زمانوں میں زندگی بسر کرنے والوں کی سرگذشت سے اپنے حال و مستقبل کی زندگی کے لئے درس عبرت حاصل کرتا ہے۔

اس لئے قرآن مجید نے اسلاف کے حالات زندگی میں دقت نظر کی دعوت دی ہے۔ اور تمام صاحبان عقل و خرد کو درس عبرت لینے کے لئے اپنے قصہ کا مخاطب تصور کیا ہے اسی لئے ارشاد ہے:

لقد کان فی قصصہم عبرۃ لاولی الالباب۱

یقیناً ان کی سرگذشت میں خردمندوں کے لئے درس عبرت ہے۔

عبرت کا لغوی معنی

عبرت کا مادہ "عبر" ہے۔ اس کا معنی، کسی چیز کے اندر سے گذرنا ہے۔ جیسے کوئی شخص کسی ندی سے گذر جائے۔۲ یا ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل ہونا ہے۔ "اعتبار" اور "عبرت" اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان کو محسوس معرفت یعنی رونما ہونے والے واقعات و حادثات کی ظاہری معرفت سے، غیر محسوس معرفت یعنی ان حادثات و واقعات کے باطن میں چھپے ہوئے اسرار و رموز کی معرفت تک پہنچا دے۔۳ اسی طرح عبرت، اس موعظہ و نصیحت کو بھی کہتے ہیں جسے انسان نے اسلاف اور ان کے ساتھ پیش آنے والے حادثات و واقعات سے حاصل کیا ہو۔۴

۱۔ یوسف ۱۱۱ ۲۔ مقاییس اللغۃ ۳۔ مفردات راغب ۴۔ مصباح المنیر

قرآنی قصوں میں درسِ عبرت کی اہمیت

قرانی قصوں کے مقاصد میں، درس عبرت سب سے اہم مقصد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنی کہانیوں میں حوادث و واقعات کی یومیہ رپورٹ اوران کی یکے بعد دیگرے پیہم منظر کشی کے بجائے اپنے مخاطبین کو حق و باطل کے پیرو کاروں کے درمیان ہوئے مقابلہ کے انجام سے واقف کراتا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ نازعات میں حضرت موسیٰ کے واقعات کی طرف ہلکا سا اشارہ کرنے کے بعد فرعون کے انجام کے سلسلہ میں فرماتا ہے:

فاخذه الله نكال الاخرة والاولىٰ ،انّ فی ذلک لعبرة لمن يخشىٰ[۱]

خدا نے فرعون کو دنیا و آخرت کے عذاب میں مبتلا کر دیا۔ درحقیقت اس داستان میں خدا سے ڈرنے والے ہر شخص کے لئے درس عبرت ہے۔

اسی طرح جنگ بدر کے قصہ میں، جنگ کے مقتولین کی تعداد اور مال غنیمت کی مقدار و کیفیت وغیرہ بیان کئے بغیر خداوند عالم کی جانب سے مومنوں کو ملنے والی مدد و نصرت کی کیفیت کا تذکرہ کیا گیا ہے تا کہ صاحبان فکر و نظر اس سے درس عبرت لے سکیں۔ چنانچہ سورہ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے:

قد كان لكم آية فی فئتين التقتا فئة تقٰتل فی سبيل الله و أخرى كافرة يرونهم مثليهم رأى العين و الله يؤيّد بنصره من يشاء ان فی ذلک لعبرةً لأولی الابصار[۲]

یقیناً مسلمانوں اور کفار قریش کے دو گروہوں کے درمیان رونما ہونے والے معرکہ میں تم لوگوں کے لئے (درس عبرت اور) نشانی ہے۔ ایک جماعت خدا کی راہ میں جنگ کر رہی تھی اور دوسرا گروہ کافر تھا

۱۔ نازعات ر۲۵، ۲۶

۲۔ آل عمران ر۱۳۔ سورۂ آل عمران میں اگر چہ پوری کہانی بیان نہیں ہوئی ہے اور اس کی تفصیل سورۂ انفال میں ہے۔ لیکن درس عبرت حاصل کرنے کے لئے اصل واقعہ سے استشہاد کافی ہے۔ کیونکہ دوسرے مقامات پر بھی مقتولین کی تعداد اور غنائم کی مقدار بیان نہیں ہوئی ہے۔

وہ مومنوں کو دو برابر دیکھ رہے تھے۔ خدا جس کی چاہتا ہے اپنی مدد سے تائید کرتا ہے۔ یقیناً اس واقعہ میں صاحبان بصیرت کے لئے درس عبرت ہے۔

اسی طرح قرآن مجید کی اکثر کہانیوں میں قبائل اور شخصیتوں کے نام و نشان سے زیادہ، ان کے اعمال کے محرکات و نتائج پر زور دیا گیا ہے اور حاشیے میں جانے کے بجائے قصہ کی عبرت انگیزی کی اہمیت کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ چنانچہ بنی نضیر کے یہودیوں کی سازش اور اطراف مدینہ سے ان کے اخراج کے واقعہ کو سورہ حشر میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:

هو الذی اخرج الذین کفروا من اهل الکتاب من دیارهم لأوّل الحشر ما ظننتم أن یخرجوا و ظنّوا انّهم مانعتهم حصونهم من الله فأتیهم الله من حیث لم یحتسبوا و قذف فی قلوبهم الرّعب یخربون بیوتهم بأیدیهم و أیدی المؤمنین فاعتبروا یاأولی الابصار [1]

اللہ وہی ہے جس نے اہل کتاب کے کافروں کو پہلے ہی اخراج میں ان کے وطن (اطراف مدینہ) سے نکال دیا تم اس کا تصور بھی نہیں کر رہے تھے کہ یہ نکل سکیں گے اور ان کا بھی یہی خیال تھا کہ ان کے قلعے انہیں خدا سے بچالیں گے۔ لیکن خدا ایسے رخ سے پیش آیا جس کا انہیں وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ ان کے دلوں میں رعب پیدا کر دیا کہ وہ اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں سے اور صاحبان ایمان کے ہاتھوں سے اجاڑنے لگے۔ پس اے صاحبان نظر عبرت حاصل کرو۔

۲۔ قاری کے لئے نمونہ عمل [2]

اچھے اور بیش بہا اخلاق کی بنیاد پر انسانوں کی تربیت قرآنی قصوں کا اہم ترین مقصد ہے۔ اور یہ مقصد نیک لوگوں کی سرگذشت، ان کے اچھے انجام، بدکاروں گنہگاروں، مجرموں کے حالات سے باخبری کے ذریعہ پورا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ نیک و صالح افراد کی سرگذشت سے واقفیت نیک کاموں

۱۔ حشر ۲

۲۔ قرآنی قصوں میں عبرت آموزی پر روشنی ڈالنے کے بعد مزید افادیت کے لئے اس عنوان کو نمایاں کیا گیا ہے تاکہ قرآنی کہانیوں کے تربیتی مقاصد کو اور زیادہ واضح کیا جا سکے۔

کی بجا آوری کے لئے قرآن کے قاریوں میں مزید شوق پیدا ہو سکتا ہے اور بدکاروں کے برے انجام سے واقفیت گناہوں اور برائیوں سے دور رہنے کے لئے مخاطبین قرآن کے ارادوں کو اور بھی زیادہ مضبوط بنا سکتی ہے۔ دنیا کی زودگذر لذتوں اور اس کے بھیانک انجام کے درمیان موازنہ، برائیوں سے بچنے کے عزم کو اور بھی زیادہ مستحکم بنا سکتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ قابیلوں، فرعونوں، قارونوں اور بلعم باعوروں سے دوری اختیار کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

حضرت آدم کے دو بیٹوں ہابیل و قابیل کی کہانی ان داستانوں میں سے ہے جن میں ''حسد'' و ''قتل ناحق'' کی قباحت اور ''تقوی'' و ''سخاوت'' کے محاسن واضح طور پر پیش کئے گئے ہیں۔ تا کہ بنی آدم کے لئے نمونہ عمل بن سکے۔ قرآن مجید میں یہ کہانی اس طرح سے بیان ہوئی ہے:

وَاتل علیهم نبأ ابنی آدم بالحق اذقرّبا قربانا فتُقُبّل من أحدهما ولم یُتقبّل من الآخر قال لأقتلنک قال انّما یتقبّل الله من المتقین ،لئن بسطت الّی یدک لتقتلنی ما أنا بباسط یدی الیک لأقتلک انی اخاف الله ربّ العالمین ۔[1]

ان کو آدم کے دونوں بیٹوں کا سچا قصہ سنایئے کہ جب دونوں نے قربانی دی ایک کی قربانی قبول ہوگئی اور دوسرے کی رد ہوگئی تو اس نے (قابیل) کہا میں تجھے قتل کروں گا دوسرے (ہابیل) نے جواب دیا (میرا کیا قصور ہے؟) خدا صرف متقیوں کے اعمال کو قبول کرتا ہے۔ اگر آپ میری طرف قتل کے لئے ہاتھ بڑھائیں گے بھی تو میں آپ کو قتل کرنے کے لئے آپ کی طرف ہرگز ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا کیونکہ میں دو جہاں کے پالنے والے اللہ سے ڈرتا ہوں۔

اس کہانی سے واقفیت کے باعث انسان کا ضمیر، انسان کو ہر قسم کے فعل ناحق کے خلاف آمادہ کرتا ہے۔ اور اس کے اندر تقوی و بردباری اپنانے کے جذبہ کو پروان چڑھاتا ہے۔ اسی لئے خداوند عالم بعد کی آیت میں اس کہانی کو بیان کرنے کا مقصد ان لفظوں میں بیان کرتا ہے:

من أجل ذٰلک کتبنا علی بنی اسرائیل أنّه من قتل نفساً بغیر نفسٍ أو فسادٍ فی الارض فکانّما قتل الناس جمیعا و من أحیا ها فکانّما أحیا الناس جمیعا ۔[2]

۱۔ مائدہ، ۲۷، ۲۸

۲۔ مائدہ، ۳۲، المیزان جلد ۵ ص ۳۲۱

اس لئے ہم نے بنی اسرائیل پر فرض کر دیا ۔ جو شخص کسی نفس کو کسی نفس کے بدلے یا روئے زمین پر فساد کی سزا کے علاوہ قتل کرے گا تو اس نے گویا سارے انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے ایک نفس کو زندگی دے دی اس نے گویا سارے انسانوں کو زندگی دے دی۔

جس طرح "قابیل"، "صاحب جنتین" "اصحاب اُخدود" قوم لوط و ثمود اور فرعون و نمرود کی کہانی قارئین کو تاریخ بشریت کی نفرت انگیز شخصیتوں اور برائی و بدکاری کے نمونوں سے آشنا کراتی ہے اسی طرح "اصحاب کہف" "مومن سورۂ یٰس" اور حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت ابراہیم اور حضرت خاتم المرسلینؐ جیسے نبیوں کی داستان قارئین قرآن کو تاریخ بشریت کی حسین ترین شخصیتوں اور لائق تقلید اچھے نمونوں سے بھی روشناس کراتی ہے۔ اور حق و حقیقت کے رہرووں کو صحیح راستہ دکھاتی ہے۔

اس لئے قرآن مجید حضرت ابراہیم کے متعدد واقعات بیان کرنے کے بعد، ایک اعلیٰ انسانی شخصیت کے مکمل اخلاص، کامل یقین، حلم و بردباری اور عفو و اغماض کی تصویر پیش کرتا ہے اور انھیں انسانی سماج کے لئے بہترین نمونۂ عمل قرار دیتا ہے۔

قد کانت لکم أسوة حسنة فی ابراهیم و الذین معه ۱

یقیناً تمھارے لئے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں (کی پیروی) میں اچھا نمونہ عمل ہے۔

اسی طرح پیغمبر اسلام کے بارے میں بھی ہے

لقد کان لکم فی رسول الله أسوة حسنة ۲

یقیناً تمھارے لئے رسول خداؐ (کی اقتداء) میں بہترین نمونہ عمل ہے۔

۳۔ پیغمبر اور مومنوں کے لئے قوت قلب

و کلاً نقص علیک من أنباء الرسل ما نثبت به فؤادک و جاءک فی هذه الحق و موعظة و ذکری للمؤمنین ۳

اور گذشتہ پیغمبروں کے واقعات آپ سے بیان کر رہے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ آپ کے دل کو مضبوط

۱۔ ممتحنہ ۴ ۲۔ احزاب ۲۱ ۳۔ ہود ۱۲۰

رکھیں ان واقعات میں آپ کے لئے حق اور مومنوں کے لئے نصیحت وسامان عبرت بھی ہے۔

یہ آیت بھی قرآنی قصوں کے ایک مقصد پر روشنی ڈال رہی ہے۔

سورہ ہود کی آیتیں رسول خداؐ پراس وقت نازل ہوئیں جب کفار قریش، آپؐ کو استہزاء و تمسخر کا نشانہ بنائے ہوئے تھے۔ مسلمانوں پران کاظلم وستم حد سے بڑھا ہوا تھا، ان کا اقتصادی بائیکاٹ تھا اور وہ شعب ابوطالب میں بڑی دردناک زندگی بسر کررہے تھے۔ کفار آنحضرتؐ پر غلط تہمتیں لگا کر عوام کو آپؐ کے قریب جانے سے روکتے تھے۔ حضرت ابوطالب اور جناب خدیجہ کی وفات سے پیغمبر اسلام و مسلمین کے غم واندوہ میں اور بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ اسی پس منظر میں خداوند عالم نے آنحضرتؐ سے خطاب فرمایا:

فلعلّک تارک بعض ما یوحیٰ الیک و ضائقٌ به صدرک أن یقولوا لو لا انزل علیه کنزٌ أو جاء معه ملک انّما أنت نذیرٌ والله علی کل شیء وکیل [1]

کیا آپ ہماری وحی کے بعض حصوں کو اس لئے ترک کرنے والے ہیں یا اس سے آپ کا سینہ اس لئے تنگ ہوا ہے کہ یہ لوگ کہیں گے کہ ان کے اوپر خزانہ کیوں نہیں نازل ہوا یا ان کے ساتھ ملک کیوں نہیں آیا؟ آپ صرف عذاب الٰہی سے ڈرانے والے ہیں۔ اللہ ہرشیء کا نگراں اور ذمہ دار ہے۔

اس کے بعد حضرت نوح، حضرت ھود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت ابراھیم، حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ جیسے انبیاء کی سرگذشت بیان کی گئی ہے کہ ان لوگوں نے کیسے کیسے الزامات، مصائب، آلام، تشدد برداشت کئے اور کم تعداد ہونے کے باوجود دشمنوں کی کثیر تعداد پر انھیں کامیابی ملی۔ سورہ کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے کہ ان تمام واقعات کو بیان کرنے کا مقصد قلب پیغمبر کو تقویت پہنچانا اور مومنوں کے حوصلے کو بلند کرنا ہے۔

سورہ شعراء میں بھی حضرت موسیٰ کی داستان میں آنحضرتؐ اور مسلمانوں کو تسلی دینے کی غرض سے آنحضرتؐ کی زندگی سے مشابہ حضرت موسیٰ کی زندگی کے بعض نکات کی طرف اشارہ

۱۔ ھود/۱۲

کیا گیا ہے منجملہ

الف۔ حضرت موسیٰ پر جنون کی تہمت

قال ان رسولکم الذی اُرسل الیکم لمجنون [۱]

فرعون نے کہا: یہ پیغمبر جو تمہارے پاس بھیجا گیا ہے وہ یقیناً پاگل ہے۔

ب۔ حضرت موسیٰ کو قید کی دھمکی

لأجعلنک من المسجونین [۲]

میں تمہیں یقیناً جیل میں بند کردوں گا۔

ج۔ قتل وتشدد کی دھمکی

لأقطعنّ ایدیکم و ارجلکم من خلاف و لأُصلّبنکم اجمعین [۳]

یقیناً میں تمہارے (توبہ کر کے حضرت موسیٰ کی پیروی کرنے والے جادوگروں کے) ہاتھ پاؤں مختلف سمتوں سے کاٹ کر تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا

د۔ حضرت موسیٰ کو حکم ہجرت

واوحینا الی موسیٰ اَن اسر بعبادی انکم متبعون [۴]

اور ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ میرے بندوں کو لے کر راتوں رات نکل جاؤ کہ تمہارا پیچھا کیا جانے والا ہے

حضرت موسیٰ کے قصہ کے اختتام میں ارشاد ہوتا ہے

و انجینا موسیٰ و من معه اجمعین ثم اغرقنا الآخرین [۵]

ہم نے موسیٰ اور ان کے تمام ساتھیوں کو نجات دلائی اور بقیہ تمام افراد کو غرق کردیا۔

ان واقعات کی یاد آوری پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کے لئے بہت تسلی بخش تھی۔ ان کے دلوں میں کامیابی کی امید جاگ اٹھی۔ اور خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے دشمنوں کی نابودی اور اپنی کامیابی کا آشکارا مشاہدہ کرنے لگے۔

۱۔ سورۂ شعراء/۲۷ ۲۔ سورۂ شعراء/۲۹ ۳۔ سورۂ شعراء/۴۹

۴۔ سورۂ شعراء/۵۲ ۵۔ سورۂ شعراء/۶۵، ۶۶

۴۔ توحید و قیامت پر ایمان لانے میں سہولت

قرآن مجید کے بہت سارے قصوں میں، خداوند عالم کا اعجازی ارادہ اور پوری کائنات پر پروردگار کی مطلقہ و بلاشریک حکومت بخوبی آشکار و نمایاں ہے اور غیر معمولی و خلاف عادت حادثات و واقعات رونما کرنے میں خداوند عالم کی لامتناہی طاقت محسوس کی جا سکتی ہے۔

قرآنی قصوں میں مذکورہ باتوں کے ذکر کا سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ اس سے مادیات کا تنگ حصار ٹوٹ جاتا ہے اور مومنوں کے ایمان کی تقویت ہوتی ہے۔ ان کے لئے قیامت پر ایمان لانا آسان ہو جاتا ہے اور دنیا و آخرت میں خدا کے وعدہ و وعید پر اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔

اس قسم کی کہانیوں کا ایک نمونہ جس کا مقصد، قیامت کے وقوع پر لوگوں کے ایمان کو مستحکم بنانا ہے وہ خدا کے صالح و مؤمن بندہ کا وہ قصہ ہے جو سورہ بقرہ میں بیان ہوا ہے:

أوْ كالذي مرّ على قرية وهي خاوية على عروشها قال أنّى يحيي هذه الله بعد موتها فاماته الله مائة عام ثم بعثه قال كم لبثت قال لبثتُ يوماً أو بعض يوم قال بل لبثت مائة عام فانظر الىٰ طعامك و شرابك لم يتسنّه و انظر الىٰ حمارك و لنجعلك آية للناس و انظر الىٰ العظام كيف ننشزها ثم نكسوها لحماً فلمّا تبيّن له قال أعلم أنّ الله على كل شيء قدير [1]

یا اس بندہ کی مثال جس کا گذر ایک قریہ سے ہوا جس کی ساری چھتیں گر چکی تھیں تو اس بندہ نے کہا خدا ان سب کو موت کے بعد کس طرح زندہ کرے گا تو خدا نے اس بندہ کو سو سال کے لئے موت دیدی اور پھر زندہ کیا اور پوچھا کہ تم کتنی دیر پڑے رہے تو اس نے کہا ایک دن یا کچھ کم۔ فرمایا نہیں، سو سال۔ ذرا اپنے کھانے اور مشروب کو تو دیکھو کہ خراب تک نہیں ہوا اور اپنے گدھے پر نگاہ کرو (کہ سڑ گل گیا ہے) اور ہم اسی طرح تمہیں (ثبوت قیامت کی خاطر) لوگوں کے لئے نشانی بنانا چاہتے ہیں۔ پھر ان ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم کس طرح ان پر گوشت چڑھاتے ہیں پھر جب اس پر یہ بات واضح ہو گئی تو اس نے

[1] ۔ بقرہ ۲۵۹

کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ خدا ہر شیء پر قادر ہے۔

خداوند عالم نے ایک طرف کھانے اور مشروبات کو سو سال تک سڑنے، خراب ہونے اور کسی قسم کی تبدیلی سے بچائے رکھا اور دوسری طرف گدھے کو سڑ گل جانے دیا کہ اس کی ھڈی کے سوا کچھ بھی باقی نہیں بچا اور پھر اسی گدھے کو زندہ کر دیا۔ انسان کو سو سال کی موت دیدی لیکن اس کے بدن کو سڑنے گلنے کی اجازت نہیں دی۔

مذکورہ آیت سے مندرجہ ذیل اہم نکات سمجھ میں آتے ہیں:[۱]

۱۔ کائنات کے ذرہ ذرہ پر خدا کی بے روک ٹوک لامحدود حکومت۔

۲۔ خدا ہر چیز کو فنا کرنے اور محفوظ رکھنے دونوں پر قدرت رکھتا ہے۔ انھیں جس شکل میں چاہے ڈھال سکتا ہے، جس طرح چاہے انھیں بدل سکتا ہے۔

۳۔ اس داستان کو بیان کرنے کا مقصد "ولنجعلک آیة للناس" "لوگوں کے لئے قیامت کے سلسلہ میں دلیل و نشانی قائم کرنا ہے۔

جس طرح یہ غیر معمولی اور خلاف عادت عمل، قیامت پر ایمان لانے کا سبب بن سکتا ہے اسی طرح نقل اور بیان کرنے کا بھی یہی نتیجہ ہوگا۔ پس اس قصہ کو بیان کرنے کا مقصد، قیامت پر لوگوں کے عقیدہ و ایمان کو مستحکم و مضبوط بنانا ہے۔

یہی نکتہ حضرت مریمؑ کے قصہ میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے کہ جب خدا نے کسی انسان سے تعلق قائم کئے بغیر حضرت مریم کو اعجاز سے بیٹا عطا کر دیا تو حضرت مریم حیرت زدہ رہ گئیں۔ خدا نے حضرت مریم کے حیرت و استعجاب کے سلسلے میں فرمایا:

... وھو علی ھین و لنجعله آیة للناس و رحمة منا و کان امراً مقضیاً.[۲]

۔ وہ میرے لئے آسان ہے، تا کہ اسے لوگوں کے لئے نشانی و علامت اور اپنی جانب سے رحمت قرار دوں اور یہ بات طے شدہ ہے۔



۱۔ المیزان جلد ۲ ص ۳۶۷ ۔ تفسیر نمونہ جلد ۲ ص ۳۱
۲۔ مریم ۲۱

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد ہے:

بئس القوم قومٌ یعیبون الامر بالمعروف و النّھی عن المنکر (وسائل الشیعہ، جلد ۱۱ص ۳۹۴)

بدترین قوم ہے وہ قوم جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو حقیر و بے وقعت سمجھتی ہو۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

انّما یأمر بالمعروف و ینھیٰ عن المنکر من کانت فیہ ثلاث خصالٍ: عالمٌ بما یأمر بہ تارک لما ینھیٰ عنہ، عادل فیما یأمر عادلٌ فیما ینھیٰ رفیق فیما یأمر رفیق فیما ینھیٰ بہ (وسائل الشیعہ۔ جلد ۱۱، ص ۴۰۳)

بس وہی شخص امر بالمعروف و نہی عن المنکر کر سکتا ہے جس میں یہ تین صفتیں پائی جاتی ہوں ۱۔ جس چیز کی دعوت دے اس سے واقف ہو جس چیز سے روک رہا ہے خود بھی اس سے اجتناب کرتا ہو ۲۔ اپنے امر و نہی میں عدل و انصاف کا لحاظ رکھتا ہو ۳۔ محبت و نرمی سے امر و نہی کرتا ہو۔

حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

ما أعمال البر کلّھا و الجھاد فی سبیل اللہ عند الأمر بالمعروف و النھی عن المنکر الّا کنفثۃ فی بحرٍ لجّیٍ (نہج البلاغہ، حکمت ۳۷۴)

تمام اچھے اعمال، یہاں تک کہ راہ خدا میں جہاد کی حیثیت بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے مقابلہ میں بس اتنی ہی ہے جتنی عظیم سمندر کے مقابلہ میں ایک معمولی قطرہ کی۔

(فرض اللہ) الامر بالمعروف مصلحۃً للعوام و النھی عن المنکر ردعاً للسفھاء (نہج البلاغہ، حکمت ۲۵۲)

اللہ نے امر بالمعروف کو سماج کی بھلائی اور نہی عن المنکر کو نادانوں کو گناہوں سے بچانے کے لئے واجب کیا ہے۔

فمن لم یعرف بقلبہ معروفا و لم ینکر منکرا، قلب فجعل اعلاہ اسفلہ و اسفلہ اعلاہ (نہج البلاغہ، حکمت ۳۷۵)

جو شخص دل سے اچھائی کو اچھا اور برائی کو برا نہیں سمجھتا تو اسے اس طرح الٹ پلٹ دیا جائے گا کہ پست بلند ہو جائے اور بلند پست۔

من امر بالمعروف شدّ ظھور المؤمنین و من نھی المنکر ارغم انوف الکافرین (نہج البلاغہ، حکمت ۳۰)

جس نے امر بالمعروف کیا اس نے مومنین کی کمر کو مضبوط کیا اور جس نے منکرات سے روکا اس نے کافروں کی ناک رگڑ دی۔

ایھا المؤمنون انه من رای عدوانا یعمل به و منکرا یدعی الیه فانکره بقلبه فقد سلم وبرء و من أنکره بلسانه فقد اجر و هو افضل من صاحبه و من أنکره بالسیف لتکون کلمة الله هی العلیا و کلمة الظالمین هی السفلی فذالک الذی أصاب سبیل الهدی و قام علی الطریق و نوّر فی قلبه الیقین (نہج البلاغہ حکمت ۳۷۳)

ایمان والو جو شخص یہ دیکھے کہ ظلم وجارحیت کا ارتکاب ہو رہا ہے، برائیوں کی طرف بلایا جا رہا ہے اور اپنے دل سے اس کا انکار کر دے تو وہ اس سے محفوظ رہ گیا اور گناہ سے بچ گیا۔ اور اگر زبان سے بھی اس کی مخالفت کر دے تو ثواب کا بھی حقدار ہو گیا اور اس کا درجہ صرف قلب سے انکار کرنے والے سے بڑا ہے۔ اور اگر کوئی شخص تلوار (اسلحہ) سے بھی اس کی روک تھام کرے تا کہ اللہ کا کلمہ بلند اور ظالموں کی بات پست ہو جائے تو یہی وہ شخص ہے جس نے ہدایت کا راستہ پالیا اور سیدھے راستہ پر قائم ہو گیا ہے اور اس کے دل میں یقین کی روشنی پیدا ہو گئی ہے۔

ان الامر بالمعروف والنهی عن المنکر لخُلقان من خلق الله سبحانه و انّهما لا یقرّبان من اجل و لا ینقصان من رزق (نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۶)

بے شک امر بالمعروف ونہی عن المنکر دو خدائی اخلاق ہیں، یہ نہ کسی کی موت کو قریب بناتے ہیں اور نہ کسی کی روزی کو کم کرتے ہیں۔

لعن الله الآمرین بالمعروف التارکین له والناهین عن المنکر العاملین به (نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۹)

اللہ لعنت کرے ان لوگوں پر جو دوسروں کو نیکیوں کا حکم دیتے ہیں اور خود عمل نہیں کرتے، سماج کو برائیوں سے روکتے ہیں مگر خود ان ہی برائیوں میں مبتلا رہتے ہیں۔

وأمر بالمعروف تکن من أهله و أنکر المنکر بیدک و لسانک و باین من فعله بجهدک (نہج البلاغہ مکتوب ۳۱)

نیکیوں کا حکم دیتے رہنا تاکہ اس کے اہل میں شمار ہو اور برائیوں کو اپنے ہاتھ اور زبان کی طاقت سے روکتے رہنا اور برائی کرنے والوں سے اپنے امکان بھر دور رہنا۔

الامر بالمعروف افضل اعمال الخلق (غرر الحکم)

امر بالمعروف (ونہی عن المنکر) بندوں کا سب سے افضل عمل ہے۔

انصروا المعروف و امروا به و تناهوا عن المنکر و انهوا عنه (غرر الحکم)

تم خود اچھے اعمال بجالاؤ اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دو، برائیوں سے بچو اور دوسروں کو بھی ان سے بچاؤ۔



کتب حدیث کی موضوعی تقسیم

جناب مہدی مہریزی

حدیثی کتابوں میں عام طور سے تمام دینی معارف پائے جاتے ہیں اور ان میں عقائد، فقہ، اخلاق اور تفسیر وغیرہ سے متعلق سبھی موضوعات بیان ہوتے ہیں۔ ان موضوعات کی تقسیم ایک دوسرے سے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ لیکن تعلیم وتفہیم کے پیش نظر انھیں ایک حد تک تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

شیعہ وسنی حدیث کے ادوار کی اجمالی رپورٹ اور حدیثی کتابوں سے سطحی واقفیت کے بعد ان کتابوں کو موضوع کے لحاظ سے تقسیم کر رہے ہیں اور ہر موضوع میں اہم ترین کتابوں کا تذکرہ کریں گے۔ اس حصہ میں شیعہ وسنی کتابوں کو علیحدہ علیحدہ پیش کیا جارہا ہے۔

۱۔ حدیثی جوامع

بعض حدیثی کتابیں، دینی معارف کے تین حصوں یعنی فقہی، اعتقادی اور اخلاقی روایتوں پر مشتمل ہیں اس قسم کی کتابوں کو "جوامع" کہا جاتا ہے۔ کچھ جوامع ایسے بھی ہیں جن کا دائرہ اس سے بھی زیادہ وسیع ہے اور ان میں تاریخ، دعا، طب، حفظان صحت اور تفسیر جیسے موضوعات بھی شامل ہیں۔

الف) شیعہ حدیثی جوامع

اس سلسلہ کے ضمن میں حسب ذیل کتابوں کا نام لیا جا سکتا ہے:

۱۔ الکافی، تالیف از محمد بن یعقوب کلینی (وفات ۳۲۹ھ)

۲۔ الوافی، تالیف از محسن فیض کاشانی (وفات ۱۰۹۱ھ)

۳۔ بحارالانوار، تالیف از محمد باقر مجلسی (وفات ۱۱۱۱ھ)

ب) سنی حدیثی جوامع

۱۔ صحیح بخاری از محمد بن اسماعیل بخاری (وفات ۲۵۶ھ)

۲۔ صحیح مسلم از مسلم بن الحجاج قشیری نیشاپوری (وفات ۲۶۱ھ)

۳۔ المستدرک علی الصحیحین از حاکم نیشاپوری (وفات ۴۰۵ھ)

۴۔ مصابیح السنۃ از حسین بن مسعود شافعی (وفات ۵۱۶ھ)

۵۔ جامع المسانید از ابن جوزی (وفات ۵۹۷ھ)

۶۔ جامع الاصول لاحادیث الرسول از ابن اثیر جزری (وفات ۶۰۶ھ)

۷۔ جامع المسانید از ابن کثیر (وفات ۶۹۴ھ)

۸۔ مجمع الزوائد از نورالدین ہیثمی (وفات ۸۰۷ھ)

۹۔ جمع الجوامع از جلال الدین سیوطی (وفات ۹۱۱ھ)

۱۰۔ کنزالعمال از علاءالدین علی المتقی (وفات ۹۷۵ھ)

۱۱۔ التاج از منصور علی ناصف (وفات ۱۳۴۷ھ)

۲۔ عقائد

اس قسم کی کتابوں میں توحید، قیامت امامت اور نبوت وغیرہ سے متعلق اعتقادی حدیثیں جمع کی گئی ہیں۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل کتابوں کا نام پیش کیا جاسکتا ہے:

۱۔ التوحید از شیخ صدوق (وفات ۳۸۱ھ)

۲۔ کمال الدین از شیخ صدوق (وفات ۳۸۱ھ)

۳۔ کفایۃ الاثر فی النص علی الائمۃ الاثنی عشر از علی بن محمد الخزاز الرازی (چوتھی صدی ہجری)

۴۔ غیبۃ النعمانی از محمد بن ابراہیم النعمانی (چوتھی صدی ہجری)

۵۔ خصائص الائمۃ از سید رضی (وفات ۴۰۶ھ)

۶۔ الغیبۃ از شیخ طوسی (وفات ۴۶۰ھ)

۷۔الاحتجاج از ابو منصور طبرسی (چھٹی صدی ہجری)
۸۔اثبات الهداة از محمد بن حسن الحر العاملی (وفات ۱۱۰۴ھ)
☆سنیوں کے یہاں عقیدہ سے مخصوص کوئی حدیثی کتاب نہیں ہے۔

۳۔فقہ

جن کتابوں میں صرف فقہ سے مربوط حدیثیں جمع کی گئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

الف) شیعہ کتابیں

۱۔من لا یحضرہ الفقیہ از شیخ صدوق (وفات ۳۸۱ھ)
۲۔تہذیب الاحکام از شیخ طوسی (وفات ۴۶۰ھ)
۳۔الاستبصار از شیخ طوسی (وفات ۴۶۰ھ)
۴۔وسائل الشیعہ از محمد بن حسن الحر العاملی (وفات ۱۱۰۴ھ)
۵۔مستدرک الوسائل از میرزا حسین نوری (وفات ۱۳۲۰ھ)

ب) سنی کتابیں

۱۔الموطاء از امام مالک (وفات ۱۷۹ھ)
۲۔سنن ابن ماجہ از محمد بن یزید بن ماجہ (وفات ۲۷۳ھ)
۳۔سنن ابی داؤد از سلیمان بن اشعث سجستانی (وفات ۲۷۵ھ)
۴۔سنن ترمذی از محمد بن عیسی بن سورہ (وفات ۲۷۹ھ)
۵۔سنن نسائی از ابو عبدالرحمان احمد بن شعیب (وفات ۳۰۳ھ)
۶۔ المنتقی از ابن تیمیہ (وفات ۶۵۲ھ)

۴۔دعائیں اور زیارات

جن کتابوں میں دعاؤں، زیارات، آداب عبادت اور اذکار و اوراد سے متعلق حدیثیں اکٹھا کی گئی ہیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہیں یہاں چند کتابوں کے نام پیش کئے جا رہے ہیں:

۱۔صحیفہ سجادیہ از امام زین العابدین (شہادت ۹۴ھ)
۲۔کامل الزیارات از جعفر بن محمد قولویہ (وفات ۳۶۷ھ)

۳۔ کتاب المزار از محمد بن نعمان (وفات ۴۱۳ھ)
۴۔ مصباح المتہجد از شیخ طوسی (وفات ۴۶۰ھ)
۵۔ الاقبال از سید بن طاؤس (وفات ۶۶۴ھ)
۶۔ فلاح السائل از سید بن طاؤس (وفات ۶۶۴ھ)
۷۔ نہج الدعوات از سید بن طاؤس (وفات ۶۶۴ھ)
۸۔ مصباح الزائر از سید بن طاؤس (وفات ۶۶۴ھ)
۹۔ المصباح از تقی الدین ابراہیم الکفعمی (وفات ۹۰۵ھ)
۱۰۔ البلد الامین از تقی الدین ابراہیم الکفعمی (وفات ۹۰۵ھ)

سنیوں کے یہاں اس موضوع پر حدیث کی کوئی مخصوص کتاب نہیں ہے۔

۵۔ تفسیر

ایسی بہت سی کتابیں ہیں جن میں تفسیری حدیثیں جمع کی گئی ہیں ان میں سے چند نام یہ ہیں:

الف) شیعہ کتابیں

۱۔ تفسیر الامام العسکری منسوب بہ امام حسن عسکری (شہادت ۲۶۰ھ)
۲۔ تفسیر العیاشی از محمد بن مسعود عیاشی سمرقندی (تیسری صدی ہجری)
۳۔ تفسیر الفرات الکوفی (تیسری صدی ہجری)
۴۔ تفسیر علی بن ابراہیم قمی (تیسری و چوتھی صدی ہجری)
۵۔ تفسیر نور الثقلین۔ از عبد علی بن جمعہ العروسی الحویزی (وفات ۱۱۱۲ھ)
۶۔ البرھان فی تفسیر القرآن۔ از سید ھاشم بحرانی (وفات ۱۱۰۷ھ)

ب) سنی کتاب

۱۔ الدر المنثور از جلال الدین سیوطی (وفات ۹۱۱ھ)

۶۔ اخلاق و آداب

اس سلسلہ میں حسب ذیل کتابوں کا نام لیا جاسکتا ہے:

۱۔المحاسن۔ازاحمد بن عبداللہ برقی (تیسری صدی ہجری)

۲۔الخصال از شیخ صدوق (وفات ۳۸۱ھ)

۳۔ثواب الاعمال از شیخ صدوق (وفات ۳۸۱ھ)

۴۔المواعظ از شیخ صدوق (وفات ۳۸۱ھ)

۵۔صفات الشیعہ از شیخ صدوق (وفات ۳۸۱ھ)

۶۔مکارم الاخلاق از حسن بن فضل الطبرسی (چھٹی صدی ہجری)

۷۔مشکاۃ الانوار از ابوالفضل علی طبرسی (چھٹی صدی ہجری)

۸۔مجموعۂ ورّام از ورام بن فراس المالکی (وفات ۶۰۵ھ)

۹۔ارشاد القلوب از حسن بن محمد دیلمی (آٹھویں صدی ہجری)

اہل سنت کے یہاں اس موضوع پر بھی کوئی حدیثی کتاب نہیں ہے۔

۷۔تاریخ و سیرت

ایسی کتابوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے جن میں پیغمبر، ائمہ یا دیگر شخصیتوں کے بارے میں حدیثیں اکٹھا کی گئی ہوں۔اس ضمن میں صرف ان ہی چند کتابوں کا نام پیش کیا جاسکتا ہے:

۱۔الغارات از ابواسحاق ابراہیم ثقفی (وفات ۲۸۳ھ)

۲۔دلائل الامامۃ از محمد بن جریر طبری (چوتھی صدی ہجری)

۳۔اختیار معارفۃ الرجال از شیخ طوسی (وفات ۴۶۰ھ)

۴۔المناقب از ابن شہر آشوب (وفات ۵۸۸ھ)

۵۔کشف الغمۃ فی معرفۃ الائمۃ از علی بن عیسیٰ الاربلی (وفات ۶۹۳ھ)

اہل سنت کے یہاں اس موضوع پر بھی کوئی حدیثی کتاب نہیں ہے۔

۸۔طب و حفظان صحت

حفظان صحت یا علاج سے متعلق حدیثوں کو جمع کرنے پر شروع ہی سے توجہ دی گئی تھی اور کچھ مخصوص کتابیں اس موضوع پر تدوین ہوئی تھیں اس ضمن میں مندرجہ ذیل کتابوں کا نام پیش کیا جاسکتا ہے:

۱۔طب الائمۃ از ابی عتاب بن سابور الزیات (تیسری صدی)

۲۔طب النبی از جعفر بن محمد مستغفری (وفات ۴۳۲ھ)

۳۔طب الائمۃ از سید عبد اللہ شبر (وفات ۱۲۴۲ھ)

اہل سنت کے یہاں اس موضوع پر بھی کوئی حدیثی کتاب نہیں ہے۔

۹۔متفرقات

بہت سی حدیثی کتابوں میں کسی موضوع پر نظم وترتیب کی رعایت کئے بغیر مختلف موضوعات سے متعلق حدیثوں کو اکٹھا کر دیا گیا ہے اس طرح کی کچھ کتابیں حسب ذیل ہیں:

۱۔علل الشرائع از شیخ صدوق (وفات ۳۸۱ھ)

۲۔عیون اخبار الرضا از شیخ صدوق (وفات ۳۸۱ھ)

۳۔معانی الاخبار از شیخ صدوق (وفات ۳۸۱ھ)

۴۔الامالی از شیخ صدوق (وفات ۳۸۱ھ)

۵۔نہج البلاغہ از سید رضی (وفات ۴۰۶ھ)

۶۔الامالی از شیخ مفید (وفات ۴۱۳ھ)

۷۔الامالی از شیخ طوسی (وفات ۴۶۰ھ)

۸۔تحف العقول از ابن شعبہ الحرانی (پانچویں صدی)

۹۔غرر الحکم از عبد الواحد تمیمی آمدی (وفات ۵۱۰ھ)

اس مقالہ کے آخر میں چند نکتوں کی یاددہانی ضروری ہے:

۱۔جن کتابوں کا یہاں تذکرہ کیا گیا ہے ان میں سب حدیثیں ہی ہیں یا اکثر حدیثیں ہیں ان موضوعات پر اور بھی بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں اس مسئلہ پر دوسرے زاویہ سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ان کے نام یہاں ذکر نہیں کئے گئے ہیں۔

۲۔حدیث کی صرف ان ہی کتابوں کو پیش کیا گیا ہے جو چودہویں صدی کے آغاز تک یعنی مستدرک الوسائل کی تالیف کے زمانہ تک لکھی گئی ہیں اس کے بعد لکھی جانے والی کتابوں کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔یہ کتابیں زیادہ تر ان ہی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔

۳۔ان کتابوں کا بہتر تعارف گذشتہ شماروں میں پیش کیا جا چکا ہے یہاں صرف مصنف کے نام تاریخ حیات یا وفات کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے۔



بچوں کی تربیت

جناب شیخ حسین مظاہری

والدین کی ایک اہم ذمہ داری بچوں کی تربیت ہے۔ اسلام نے اس فریضہ کو بہت اہمیت دی ہے۔ بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں ایک ہزار سے زائد حدیثیں رسول خداؐ اور ائمہ طاہرینؑ سے نقل ہوئی ہیں۔ جن میں سے تقریباً پانچ سو روایتیں "وسائل الشیعہ" میں درج ہیں۔

اسلام نے اپنے تربیتی منصوبہ میں، بچوں کی اسلامی تربیت کے لئے کچھ احکام و قوانین وضع کئے ہیں جن میں سے کچھ کا تعلق پیدائش سے پہلے کے مرحلے سے ہے اور کچھ کا پیدائش کے بعد کے مرحلے سے۔ بچوں کی تربیت کے اسباب وعلل کو اسلام نے والدین کی شادی کے شرائط وضوابط میں بھی مدنظر رکھا ہے کیوں کہ وراثت کے مسلمہ قانون کے مطابق، والدین کی شخصیت، بچوں کی شخصیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

انتخاب همسر کا معیار

مذکورہ حقیقت کے پیش نظر اسلام نے همسر وشریک حیات کے انتخاب کے لئے کچھ معیار معین کئے ہیں اور زن ومرد کو ان سے آگاہ کردیا ہے۔ چنانچہ پیغمبر اسلام کا ارشاد ہے:

ایاکم و خضراء الدمن. قیل یا رسول اللہ و ما خضراء الدمن؟ قال المرأة الحسناء فی منبت السوء.[1]

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۴ ص ۱۹

کوڑے کی سبزی سے بچو، لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ''کوڑے کی سبزی کیا ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا: برے ماحول اور پست گھرانے میں پرورش پانے والی خوبصورت عورت۔

اسلامی نقطۂ نظر سے برا گھرانہ وہ گھرانہ ہے جہاں دین و اخلاق کا فقدان ہو۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

اذا جائکم من ترضون خلقه و دینه فزوّجوه (۱)

اگر تمھارے پاس کوئی ایسا شخص رشتہ لے کر آئے جس کا اخلاق اور دین تمھیں پسند ہے تو اس سے شادی کر دو۔

حدیث میں شادی کے لیے دو اصل معیار، بیان کیے گئے ہیں: ''دین داری'' اور ''اچھا اخلاق'' یہ معیار لڑکے اور لڑکی دونوں کے لیے ہے، اب اچھے اخلاق اور دینداری کے ساتھ، دولت، حسن اور اچھا خاندان بھی ہو تو کیا کہنا لیکن بنیادی و اصلی شرط، دین داری اور اچھا اخلاق ہی ہے۔

شادی کی ناکامی کی وجہ

روایتوں میں ہے کہ جو لوگ دینداری و حسن اخلاق کی رعایت کیے بغیر صرف حسن و دولت کی لالچ میں شریک زندگی کا انتخاب کرتے ہیں وہ اپنی ازدواجی زندگی میں یقیناً ناکام ہوں گے اور تجربہ نے بھی یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر لڑکی دیندار نہ ہو اور اچھے اخلاق سے آراستہ نہ ہو تو اس کا حسن و جمال اس کے انحراف و گمراہی کا باعث بن سکتا ہے۔ عصمت فروشی و بے حیائی کے اکثر واقعات کا سرچشمہ وہی حسن و جمال ہے جو دینداری اور انسانی اخلاق سے بے بہرہ ہوتا ہے۔

اس معیار کا فلسفہ

دین داری اور حسن اخلاق پر اسلام نے ''قانون وراثت'' کے پیش نظر زور دیا ہے۔ کیوں کہ علم نفسیات میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ہر انسان میں ''جین''

۱۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۴ ص ۵

نامی ایک مخلوق ہے جو ماں باپ کے ظاہری و باطنی اوصاف بچہ میں منتقل کرتا ہے۔

ماں کے نفسیاتی حالات و افکار اس کے پیٹ میں پلنے والے بچہ پر اثر انداز ہوتے ہیں کیوں کہ فکری و نفسیاتی نقائص ماں کے جسم اور اس کے معدہ کو متاثر کرتے ہیں جب بچہ ماں کے بدن سے اپنی غذا حاصل کرتا ہے تو غذا کے ذریعہ یہ اثر بھی بچہ میں منتقل ہوتے ہیں۔ بچہ کے نفسیاتی حالات اور اس کی شخصیت کو شکل دیتے ہیں۔

بچہ کی شخصیت پر ماحول کے اثرات:

ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ بچہ کی مادی و روحانی پرورش میں ماحول بھی اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ بعض عظیم شخصیتوں کے حالات زندگی میں یہ ملتا ہے کہ ان کی مائیں، حمل کے ایام میں ہمہ وقت، ذکر الٰہی میں مشغول رہتی تھیں اور ولادت کے بعد اپنے بچوں کو ذکر الٰہی اور وضوء کیے بغیر دودھ نہیں پلاتی تھیں۔

اسی طرح بچہ کے نفسیاتی و حیاتی حالات و کیفیات میں، انعقاد نطفہ کی جگہ اور وقت کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اس سلسلہ میں بھی ائمہ معصومین سے بہت سی روایتیں نقل ہوئی ہیں۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

تزوّجوا فی الحجر الصالح فان العرق دساس مکارم

صالح اور نیک آغوش میں شادی کرو کیوں کہ جین خصلتوں کو منتقل کرتے ہیں۔

اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ ''عرق'' (جین) والدین کے صفات بچوں میں منتقل کرتی ہے۔ یعنی اگر ہمسری کے لیے خوبصورت مگر بے دین لڑکی کا انتخاب کریں گے تو یقیناً بیوی کی لادینیت بچہ کی شخصیت پر اثر انداز ہوگی۔

بعض قبیلوں اور خاندانوں کی تاریخ کا مطالعہ اس تاثیر کی گواہی دیتا ہے کیوں کہ بعض قبیلے ذاتا، متکبر، حاسد یا مغرور نظر آتے ہیں یہ برے اوصاف جین کے ذریعہ نسلا بعد نسل منتقل ہوتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اس قوم قبیلہ کی پہچان بن گئے۔

بے جا تکلفات سے پرہیز

اسلام نے شادی کرنے اور نسل بڑھانے کے سلسلہ میں ایک اور اہم مسئلہ جس پر

بہت زیادہ زور دیا ہے وہ بے جا تکلفات سے پرہیز اور سادگی سے شادی کرنا ہے۔

اصولی طور پر اسلام، تکلفات کا اور "پروٹوکول" کا مخالف ہے کیوں کہ ترقی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کے سوا تکلفات کا کوئی فائدہ نہیں۔ خاص طور سے شادی جیسے اہم معاملہ میں "بھاری مہر"، "زیادہ اور قیمتی جہیز"، "طرفین کا سخت موقف" اور "نا معقول بہانہ بازیاں" اور اس طرح کے دوسرے تکلفات و پروٹوکول نے شادی کو مشکل بنا دیا ہے جس کے باعث شادی کی عمر بڑھتی جا رہی ہے اور اسلام اس کے سخت خلاف ہے۔

علاوہ بریں یہ تکلفات و رسومات، میاں بیوی کے درمیان باہمی الفت و محبت کا رشتہ بھی قائم نہیں ہونے دیتے۔ اگر میاں بیوی کے درمیان محبت کا رشتہ قائم نہ ہوگا تو گھر کا ماحول تاریک و بے جان ہوگا۔ حرارت وحیات مفقود ہوگی۔ اور ایسے ماحول میں پروان چڑھنے والے بچے بھی فطری طور پر مہر و محبت سے عاری ہوں گے اور قوی امکان یہی ہے کہ وہ سماج کے لیے مفید رکن نہ بن سکیں گے۔

مہر اور جہیز

مروجہ رسم و رواج میں سے ایک رسم، مہر ہے۔ اس رسم کے باعث دولھا اور دلہن کے گھر والے "مول بھاؤ" اور "کم و زیادہ" کرنے میں بہت سا وقت گنوا دیتے ہیں اور کبھی کبھی ناخوشگوار حادثات بھی رونما ہو جاتے ہیں۔ مہر کو اس طرح سے طے کرتے ہیں گویا خرید و فروش ہو رہی ہے اور لڑکی کی شخصیت کو پیسے سے تولا جا رہا ہے۔ اسلام اس قسم کی سودے بازی کو تسلیم نہیں کرتا۔ کیوں کہ یہ نامعقول رسم شروع ہی سے میاں بیوی کی باہمی محبت کو زخمی کر دیتی ہے اور اختلاف کا بیج بو دیتی ہے۔ بہت سے اختلافات کا سرچشمہ یہی رسم ہے۔

جہیز کا بھی یہی حال ہے، جہیز کو دھندہ بنا لیا گیا ہے۔ اگر کسی لڑکی کا جہیز ہلکا یا کم قیمت ہو تو نفرتوں کا سیلاب امڈ پڑتا ہے لڑکی کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ اسلام اس قسم

کے جہیز کا سخت مخالف ہے۔صدر اسلام میں ایسی شادی نہیں ہوتی تھی۔تکلفات سے دور نہایت سادے انداز سے شادی ہوتی تھی حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کا مہر صرف ۵۰۰ درھم تھا اور جہیز بھی نہایت معمولی۔ یہ شادی، مسلمانوں کے لیے نمونہ عمل وسرمشق ہونی چاہیے۔اور تمام بے جا رسومات وتکلفات سے اجتناب کرنا چاہیے۔

دعوت ولیمہ

ہمیں ولیمہ پر نظر ثانی کرنی چاہیے اور حضرت علی و فاطمہ زہراؑ کی شادی کو نمونہ عمل قرار دینا چاہیے۔اس مبارک شادی میں ولیمہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔لیکن پر تکلف دعوت کا نام ونشان بھی نہ تھا۔''ولیمہ'' مستحب ہے پر تکلف دعوت نہیں۔

روایت ہے یہ کہ ایک شخص نے امیر المومنینؑ سے عرض کیا کہ آج شب میرے بیٹے کی شادی کا ولیمہ ہے آپ سے شرکت کی درخواست ہے، حضرتؑ نے پوچھا: کن لوگوں کو بلایا ہے؟ اس نے شہر کے چند''بڑے''لوگوں کا نام لیا۔حضرت نے فرمایا: غریبوں اور محروموں کو کیوں نہیں بلایا؟ اس نے جواب دیا آج ''بڑوں'' کی دعوت ہے اور کل غریبوں کو بلائیں گے۔امامؑ نے فرمایا: میں بھی کل، غریبوں ہی کے ساتھ آؤں گا۔اس نے عرض کیا: میں کسی غریب کو پہچانتا ہی نہیں جس کی دعوت کروں حضرتؑ نے فرمایا: میں کل غریبوں کو ساتھ لے کر آؤں گا۔مقررہ وقت پر امام پچاس غریبوں کو ساتھ لے کر اس دعوت ولیمہ میں شریک ہوئے۔

حضرت علیؑ کا ولیمہ

امامؑ خود اپنی شادی کے ولیمہ کے متعلق فرماتے ہیں: رسول خداؐ نے مجھ سے فرمایا: اے علی! شادی کے لیے دعوت ولیمہ کا انتظام کرو، آپؐ نے گوشت اور روٹی فراہم کرنے کی ذمہ داری خود لے لی تیل اور خرما فراہم کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپ دی۔ رسول خداؐ نے کھانا تیار کرنے میں بہ نفس نفیس خود مدد فرمائی، اس کے بعد مجھے حکم دیا کہ جسے چاہوں اس ولیمہ میں دعوت دوں۔ میں مسجد جا کر سب کو بلا لایا۔ مسجد میں موجود

اکثر افراد غریب محتاج تھے ۔ وہ سب لوگ میرے گھر آ گئے ۔ مجھے مہمانوں کی کثیر تعداد اور کھانے کی قلیل مقدار دیکھ کر شرم آنے لگی ۔ جب پیغمبرؐ نے میرا یہ حال دیکھا تو فرمایا: میں دعا کروں گا خدا تمھارے کھانے میں برکت دے گا۔

بچہ کی شخصیت پر کھانے کا اثر

بچوں کی شخصیت کی تشکیل میں، غذا بھی موثر ہے، اگر نطفہ، حرام مال سے تشکیل پائے گا ۔ یا ماں، حمل کے ایام میں حرام کھانا کھائے گی تو بچے کی طبیعت میں شقاوت و بد بختی کے لیے زمین ہموار ہو جائے گی اسی طرح بچہ، ولادت کے بعد اگر حرام غذائیں کھائے گا تو بھی اس میں شقاوت و بد بختی کے جراثیم پیدا ہو جائیں گے۔

حضرت زہرا کی ولادت کے مقدمات

حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کی ولادت کا ایک مقدمہ یہ تھا کہ خداوند عالم نے اپنے رسولؐ اور جناب خدیجہ کو عوام الناس سے دوری اختیار کر لینے کا حکم دیا۔ آنحضرت مکہ سے دور غار حرا میں چالیس شب و روز خدا کی عبادت میں مشغول رہے ۔ اس مدت میں حضرت خدیجہ نے بھی گھر میں گوشہ نشینی اختیار کر لی وہ کسی سے ملاقات نہیں کرتی تھیں ۔ چالیسویں دن پیغمبر اکرم کو گھر جانے کا حکم ملا ۔ شب چہلم، جبرئیل نے خدا کا یہ پیغام پہنچایا کہ یا رسول اللہ خدا نے آپ کو سلام کہلایا ہے اور بہشت کا یہ سیب آپ کے لیے بھیجا ہے پیغمبرؐ نے سیب لے کر اسے اپنے سینے سے دبایا جب سیب دو ٹکڑے ہوا تو اس سے ایک نور چمکا ۔ جبرئیل نے کہا: یا رسول اللہ! یہ نور اس خاتون کا نور ہے جو آسمان پر "منصورہ" ہے اور زمین پر" فاطمہ" ہے (۱)

اس حدیث سے، بچوں کی شخصیت کی تشکیل میں غذا کا اثر واضح ہو جاتا ہے۔

غذا کے متعلق قرآنی نظریہ

قرآن مجید میں اس سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے:

انّ الذین یاکلون اموال الیتامیٰ ظلما انما یاکلون فی بطونھم نارا

۱۔ بحار الانوار جلد ۴۳

وسیصلون سعیراً (۱)

جو لوگ ظالمانہ طریقہ سے یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ درحقیقت اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں اور جلد ہی وہ بھڑکتی ہوئی آگ کے درمیان جہنم میں گر جائیں گے۔

عالم ملکوت کا نظارہ کرنے والی آنکھوں کے مالک، ایسے لوگوں کے آگ کھانے کا بخوبی مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ آگ سے منعقد ہونے والا نطفہ، مستقبل میں کیسے کیسے بھیانک جرائم کا مرتکب ہوگا۔

لہٰذا جس بچہ کا نطفہ، سودخوری، چوری اور دیگر حرام طریقوں سے حاصل کیے ہوئے مال سے منعقد ہوگا اس کی طبیعت اسے ارتکاب حرام کی طرف ڈھکیلے گی۔

بچہ کے مادی رشد میں غذا کا اثر

اسی طرح، مقوی و مناسب غذا، بچہ کی جسمانی لطافت پر اچھا اثر ڈالتی ہے۔ حدیثوں میں ہے کہ حاملہ عورت کو سیب خرما اور بہی جیسی طاقت بخش غذائیں کھانی چاہیے (۲) تاکہ بچہ خوبصورت و بردبار پیدا ہو۔ امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ:

نظر الی غلام جمیل، فقال: ینبغی أن یکون أبو هذا أکل سفر جلا لیلة الجماع (۳)

آپ کی نظر ایک خوبصورت بچہ پر پڑی۔ آپ نے فرمایا: اس کے باپ نے ہم بستری کی شب بہی کھایا ہوگا۔

آج کے سائنسدانوں کی نظر میں بھی ایام حمل اور طفولیت کے دوران، غذا، بچہ کے جسمانی توازن اور رنگ روپ میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جس طرح سے اچھی اور خوشبودار غذا، بچہ کے ظاہری رنگ و روپ پر مناسب اثر کرتی ہے اسی طرح سے حرام و مشکوک غذائیں منفی اثر چھوڑتی ہیں۔ اور اس کا اثر کہیں زیادہ اہم اور حساس

۱۔ نساء/۱۰

۲۔ ایک روایت میں معصوم فرماتے ہیں اپنی عورتوں کو بہی کھلاؤ اس سے تمھارے بچے خوبصورت ہوں گے۔ رسول خدا کا ارشاد ہے جس مہینہ میں بچہ پیدا ہونے والا ہو اس ماہ میں حاملہ کو خرما کھلاؤ اس کا بچہ بردبار و پرہیزگار ہوگا (مکارم الاخلاق ص ۸۷)

۳۔ مکارم الاخلاق ص ۸۶

ہے۔ کیوں کہ یہ غذا بچوں کے نفسیات اور اس کی شخصیت کو متاثر کرتی ہے۔

آداب غذا کی تاثیر

علاوہ بریں کھانے کا طور طریقہ بھی بچہ کے نفسیات کو متاثر کرتا ہے کھانے کے شروع میں بسم اللہ اور آخر میں الحمد للہ کہنا اور دیگر آداب غذا کی رعایت افراد کی شخصیت کی تعمیر میں بہت مؤثر ہے۔

علامہ مجلسی کا واقعہ

علامہ محمد تقی مجلسی کا ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے جس کی آیات و روایات اور تجربہ سے بھی تصدیق ہوتی ہے۔ علامہ اصفہان کی جامع مسجد میں نماز پڑھاتے تھے۔ ایک شب علامہ اپنے بیٹے "محمد باقر مجلسی" کو اپنے ساتھ مسجد لے کر آئے۔ محمد باقر مجلسی، مسجد کے اندر جانے کے بجائے صحن مسجد میں بیٹھ گئے۔ والد کے جانے کے بعد انھوں نے صحن میں رکھی ہوئی پانی سے بھری ہوئی مشک میں سوئی چبھو دی اور اس سے بہنے والے پانی سے کھیلنے لگے۔ نماز کے بعد جب ان کے والد کو اطلاع ملی تو انھیں بہت رنج ہوا۔ گھر جاکر اپنی اہلیہ سے کہا: میں نے نطفہ کے انعقاد سے پہلے اور بعد میں، طفولیت و بچپن کے ایام میں کھانے پینے اور اسلامی آداب زندگی کی رعایت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن ہمارے بچے کی آج کی حرکت یہ بتاتی ہے کہ ہم دونوں میں سے کسی ایک سے کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ضرور ہوئی ہے۔

محمد باقر مجلسی کی ماں نے جواب دیا: جب محمد باقر پیٹ میں تھے تو میں ایک دن پڑوسی کے گھر گئی ہوئی تھی۔ وہاں درخت پر انار لگا ہوا تھا۔ انار دیکھ کر مجھے لالچ آگئی چنانچہ میں نے ایک انار میں سوئی چبھو دی تاکہ اس کا مزہ چکھ سکوں یہ اس کا نتیجہ ہے۔

حمل کے دوران ماں نے پڑوسی کے انار میں جو سوئی چبھوئی تھی اس نے بچہ کی شخصیت پر کتنا اثر کیا اور وہ کس طرح سے بچہ کے اعمال میں ظاہر ہوئی۔ حرام غذائیں، زندگی کے ہر موڑ پر انسان پر برا اثر چھوڑتی ہیں اور اس کے کردار و رفتار میں اپنا اثر دکھاتی

ہیں۔ حرام غذائیں زاہدوں اور عابدوں کو دنیا دار بنا کر حرام کاموں کے ارتکاب کے لئے آمادہ کرتی ہیں۔

شیطان کی مشارکت

قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وشارکھم فی الاموال والا ولاد وعدھم ومایعدھم الشیطان الا غرورا

(اسراء/۶۴)

(اے شیطان) مال ودولت اور بچوں میں بھی ان کا شریک بن جا اور جھوٹے وعدوں کے ذریعہ انھیں دھوکا اور فریب دے۔ شیطان کا وعدہ جھوٹ اور فریب کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

روایتوں میں ہے کہ، شیطان کی مشارکت کا ایک مصداق، حرام غذاؤں سے نطفہ کا انعقاد ہے۔ یعنی اگر بچہ کا نطفہ ایسے حال میں منعقد ہو کہ اس کے باپ کے ذہن میں کوئی حرام خیال، پروان چڑھ رہا ہو یا اس کی صحیح طریقہ سے تربیت نہ کی جائے تو وہ صالح و نیک انسان نہیں بن سکتا اور درحقیقت شیطان اس کی پرورش میں اس کے باپ کا شریک ہوگا۔

بسم اللہ کا اثر

ہر مسلمان کو کھانے کے حرام وحلال ہونے کا پورا خیال رکھنا چاہیے۔ مشکوک غذاؤں کو "دعا"، "خدا کے نام" اور "توسل" کے ساتھ خالص عقیدہ سے کھانا چاہیے۔ اگر مسلمان کا دل گناہوں کے زنگ سے پاک وصاف ہو اور اسلامی احکام وقوانین کا پابند ہو تو وہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ جنگ قادسیہ میں لشکر اسلام کے مسلمان کمانڈر نے مجوسیوں سے کہا: قرآن، ہمارا محافظ ہے، مجوسی کمانڈر نے زہر کا پیالہ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا اگر قرآن تمہارا محافظ ہے تو پھر اس زہر کے پیالہ سے تمہیں نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ لشکر اسلام کے سردار نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کہہ کر وہ زہر کا پیالہ پی لیا اور بسم اللہ کی برکت سے اس زہر نے اس پر کوئی اثر نہیں کیا کیوں کہ عقیدہ وایمان اس میں شامل ہو گیا تھا۔ اس سلسلہ میں بیان کرنے کے لیے بہت کچھ ہے لیکن مختصر

یہ کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، مشکوک غذاؤں کے برے اثرات کو زائل کر دیتا ہے۔

ماؤں کو چاہیے کہ بچوں کو دودھ پلاتے یا انھیں کھانا کھلاتے وقت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی ضرور تلاوت کریں۔

فطرت

قرآن و احادیث کے مطابق، انسان کی فطرت، اسلام اور اس کے بنیادی قوانین کو قبول کر چکی ہے۔ یہ قوانین، اس کی سرشت میں شامل ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی انسان "اسلام" اور اس کے "بنیادی قوانین" سے منحرف ہو جاتا ہے تو اس کے انحراف و گمراہی کے ذمہ دار سب سے پہلے اس کے والدین ہیں پھر اس کے اساتذہ اور تیسرے مرحلہ میں سماج و ماحول ذمہ دار ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

فاقم وجھك للدین حنیفا فطرة الله التی فطر الناس علیها لاتبدیل لخلق الله ذالك الدین القیم ولكن اكثر الناس لا یعلمون (۱)

اپنا رخ دین یکتا پرستی کی طرف موڑلو یہ دین وہ فطرت الٰہی ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور خلقت الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے یقیناً یہی سیدھا اور مستحکم دین ہے مگر اکثر لوگ اس سے بے خبر ہیں۔

اسی طرح حدیث میں ارشاد ہوتا ہے:

كلّ مولود یولد علی الفطرة حتی یكون ابواه یهودانه وینصرانه (او یمجسانه)(۲)

ہر بچہ اپنی فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے یہ اس کے والدین ہیں جو اسے یہودی و عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

ہر بچہ کی فطرت میں اسلام موجود ہے اگر وہ دنیا میں قدم رکھنے اور پروان چڑھنے کے بعد یہودی، عیسائی یا مجوسی بن جاتا ہے تو فطرت سے انحراف کا سبب اس کے ماں باپ ہیں۔ جنھوں نے بری وراثت یا غذا و تربیت کے ذریعہ اس کے حق میں ظلم کیا ہے۔

۱۔ روم/۳۰		۲۔ سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۳۷۳

سعادت وشقاوت، والدین سے وابستہ

قرآن مجید نے صاف لفظوں میں بیان کردیا ہے کہ اگر والدین اپنے بچوں کی پرورش وتربیت میں کوتاہی کریں گے تو قیامت کے دن گھاٹے میں رہیں گے۔

اگر کوئی لڑکی بے حیائی پر اتر آتی ہے۔ اسلامی قوانین کی خلاف ورزی کرتی ہے۔ کوئی لڑکا اسلام سے منہ موڑ لیتا ہے دین سے بے اعتنائی برتتا ہے اور اس کا سبب والدین کی غلط تربیت یا اس سلسلہ میں ان کی کوتاہی ہو تو قیامت کے دن ان لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ ان کے والدین بھی جہنم میں ڈالے جائیں گے چاہے بظاہر وہ اچھے انسان ہی کیوں نہ ہوں۔

علامہ مجلسی نے ''حلیۃ المتقین'' میں اس مفہوم کی بہت سی حدیثیں نقل کی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بچوں کی سعادت و بدبختی کا والدین سے براہ راست تعلق ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے:

الشقی من شقی فی بطن امہ والسعید من سعد فی بطن امہ (۱)

بدبخت وشقی وہ ہے جو اپنی ماں کے پیٹ ہی میں شقی ہو گیا اور سعید وخوش بخت وہ ہے جسے ماں کے پیٹ ہی میں سعادت وخوش بختی نصیب ہو گئی اسی لیے اسلام نے جسمانی ونفسیاتی طور پر ناقص، و فاسد نسل کے وجود میں آنے کی روک تھام کے لیے ضروری ومفید تعلیمات پیش کی ہیں کہ اگر ان تعلیمات پر عمل کیا جائے تو انحراف وگمراہی کا بہت کم امکان رہ جاتا ہے کیوں کہ اس کے باعث گناہ کو پروان چڑھانے والے اسباب وعوامل کمزور پڑ جاتے ہیں۔ اگر والدین کی تمام احتیاطات اور اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کے باوجود کوئی بچہ منحرف وگمراہ ہو جاتا ہے تو اس کا وہ خود ذمہ دار ہوگا۔ ماں باپ سے باز پرس نہیں ہوگی۔

شیخ فضل اللہ نوری کا واقعہ

ایک بزرگ شخصیت کا بیان ہے کہ میں نے شیخ فضل اللہ نوری کی شہادت سے کچھ

۱۔ سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۷۰۹

دن قبل، جیل میں ان سے ملاقات کی میں نے عرض کیا آپ کا بیٹا دینی قوانین کی رعایت نہیں کرتا اور آپ کے خلاف کام کرتا ہے۔ شیخ شہید نے فرمایا: مجھے اس کا پہلے ہی سے علم تھا یہ لڑکا، نجف میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی ماں کا دودھ خشک ہو گیا تھا لہٰذا اسے دودھ پلانے کے لیے ایک دائی کا انتظام کرنا پڑا۔ ایک مدت کے بعد یہ پتہ چلا کہ اسے دودھ پلانے والی عورت پاکدامن نہیں ہے اور دل میں امیر المومنینؑ سے بغض و عداوت رکھتی ہے۔ مجھے اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ اس لڑکے کا خوش بخت و سعادتمند ہونا بہت مشکل ہے(۱)

یاددہانی

یہ ہم سب کے لیے وارننگ ہے کہ ہمیں اپنی غذا کا پورا پورا خیال رکھنا چاہیے اور بھرپور کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے بچوں کا نطفہ اہل بیت کی محبت کے ساتھ منعقد ہو۔ یہ ہم تمام مردوں کی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ اگر خدانخواستہ، حرام غذا کے باعث ہمارے بچے اسلام اور الٰہی فطرت سے منحرف ہو گئے تو قیامت کے دن ہم سب جواب دہ ہوں گے اور اس دن ہمارے یہی بچے خدا سے ہماری شکایت کریں گے۔

والدین ہوشیار رہیں کہ نطفہ کے انعقاد کے وقت اور اس سے پہلے خدا و محبت اہل بیت علیہم السلام کے سوا کسی چیز کے بارہ میں نہ سوچیں۔

والدین کی سوچ کا اثر

حدیث میں ہے کہ ایک گوری عورت کے یہاں کالا بچہ پیدا ہوا، جس کے باعث گھر میں بھونچال آ گیا۔ کنبہ والے اس کی پاکدامنی پر شک کرنے لگے۔ جب جھگڑا زیادہ بڑھا تو مقدمہ حضرت علیؑ کی عدالت میں پیش ہوا۔ تحقیقات کے بعد امامؑ کے لیے یہ واضح ہو گیا کہ عورت گناہگار نہیں ہے لہٰذا امام نے اس مقدمہ کا ایک دوسری طرح سے جائزہ لیا۔ آپ نے دریافت فرمایا: اس بچہ کا نطفہ منعقد ہوتے وقت کیا

(۱) تودہ سوشلسٹ پارٹی کا سربراہ نورالدین کیانوری شیخ فضل اللہ نوری کے اپنے بیٹے کا فرزند تھا۔ جب شیخ کو پھانسی دی گئی تو یہ لڑکا خوشی منا رہا تھا۔

تمھارے کمرہ میں کوئی تصویر موجود تھی؟ انھوں نے عرض کیا: جی ہاں ایک حبشی غلام کی تصویر دیوار پر آویزاں تھی۔

امیر المومنین نے فرمایا: یہ نومولود بچہ، حلال زادہ ہے اور تمھاری اپنی اولاد ہے۔ چونکہ انعقاد نطفہ کے وقت مرد کی نگاہ اس تصویر پر تھی لہٰذا اس نگاہ کی تاثیر سے بچہ کا رنگ کالا ہو گیا۔

بچوں کے ناقص الاعضاء ہونے میں والدین کا قصور

خداوند عالم، ماں کے پیٹ میں بچہ کو صحیح سالم اور خوبصورت بناتا ہے لیکن ماں باپ کی خطائیں اور گناہ اس کے ناقص الاعضاء یا گناہگار بننے کا سبب بنتے ہیں۔

لہٰذا عورت کو حمل کے ایام میں اپنے حرکات وسکنات اور اپنی سوچ پر کنٹرول رکھنا چاہیے۔گناہ سے بچنا چاہیے۔دینی فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔ خوش وخرم رہنا چاہیے۔شیطانی وسوسوں سے دور رہتے ہوئے کثرت سے دعائیں اور زیارتیں پڑھتے رہنا چاہیے زبان پر ہمہ وقت ذکر الٰہی ہونا چاہیے تاکہ اس کے بچہ کی روح وجسم سالم رہے۔اور اس کی سعادت وخوش بختی کی زمین ہموار ہو جائے۔مفلوج یا ناقص العضو یا نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا پیدا ہونے والے بچے ماں باپ کی خطاؤں کا نتیجہ ہیں۔

حاملہ عورت جس گھر میں سانس لیتی ہے اگر وہ گناہوں سے آلودہ ہوگا۔لڑائی جھگڑے اور غم وغصہ سے لبریز ہوگا تو بچہ گونگا پیدا ہوگا یا نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہوگا۔

بچوں کی شخصیت پر نیت کا اثر

کار خیر کی نیت پر خدا کی بارگاہ سے ثواب ملتا ہے۔لیکن خدا کا ایک بڑا لطف وکرم یہ ہے کہ گناہ کی نیت اور اس کے متعلق سوچنے پر خدا عذاب نہیں کرتا۔ جب تک انسان گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا اسے سزا نہیں ملتی، لیکن گناہ کے متعلق سوچنے اور اس کے ارتکاب کا ارادہ کرنے سے انسان کا دل ضرور متاثر ہوتا ہے اور اس کے منفی آثار نمایاں ہوتے ہیں۔

اسی لیے حضرت عیسیٰ نے اپنے حواریوں کو نصیحت کی تھی "کہ میرے بھائی موسیٰ نے فرمایا ہے: "زنا نہ کرو" لیکن میں کہتا ہوں "زنا کرنے کے بارہ میں سوچو بھی نہیں کیوں کہ زنا کے متعلق سوچنے سے دل سیاہ ہو جاتا ہے"

گناہ کا ارادہ کرنا اگرچہ گناہ نہیں ہے لیکن انسان کا دل اور ماں کے پیٹ میں پلنے والے بچہ کی سوچ پر ضرور برا اثر پڑتا ہے۔

حجاج کی شقاوت

حجاج بن یوسف ثقفی بہت برا انسان تھا، شقاوت کے میدان میں اس نے سب کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اس نے خود اپنے اعتراف کے مطابق بیس ہزار شیعوں کو محبت اہل بیت کے جرم میں شہید کیا ہے۔ اس نے ایک ایسا قید خانہ بنایا تھا جہاں قیدی دن کی دھوپ اور رات کی اوس سے محفوظ نہیں تھے اور انہیں راکھ ملی ہوئی صرف دو روٹیاں کھانے کو دی جاتی تھی، قیدی، شدائد اور مصائب کی تاب نہ لا کر چند دنوں میں اس دنیا سے گزر جاتے تھے۔

یہ خبیث انسان اتنا شقی و ظالم تھا کہ خود کہا کرتا تھا کہ مجھے سب سے زیادہ لذت اس وقت ملتی ہے جب میں کسی شیعہ کو اپنے خون میں تڑپتا دیکھتا ہوں۔ اسی لیے کھانے کے وقت وہ کسی شیعہ کا سر اپنی نگاہوں کے سامنے قلم کرنے کا حکم دیتا تھا تا کہ اس کا کھانا کسی شیعہ کے اپنے خون میں تڑپنے کے ہمراہ ہو۔ اتنی شقاوت و قساوت قلبی، اس کے نطفہ میں شیطان کی شرکت کا نتیجہ تھی۔ امام زین العابدینؑ اور امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ حجاج کی شقاوت و قساوت اس کے نطفہ میں شیطان کی مشارکت کے باعث تھی۔ تاریخ کے مطالعہ سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ حجاج کی ماں کو اپنی عفت و پاکدامنی کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

نطفہ کے انعقاد میں نیت کا اثر

شیخ انصاری کے متعلق مشہور ہے کہ آپ کی والدہ، حمل کے زمانہ میں کبھی بھی وضو کے بغیر نہیں رہتی تھیں۔ جب تک آپ کو دودھ پلاتی رہیں ہمیشہ باوضو رہیں۔ انعقاد

نطفہ کے وقت اس میں شک نہیں ہے کہ اعمال صالح اور ثواب کی نیت اور ارادہ، بچوں کی سوچ اور ان کے مستقبل پر مثبت اور مفید اثر ڈالتا ہے۔ اور گناہ آلود خیال، برا اثر ڈالتا ہے، اس لیے ماؤں کو چاہیے کہ حمل اور دودھ پلانے کے زمانہ میں ہمیشہ طہارت سے رہیں۔ ماں اور باپ دونوں نامحرم پر نظر ڈالنے سے پرہیز کریں کیوں کہ یہ چیزیں بچہ کی بدبختی کے لیے زمین ہموار کرتی ہیں۔ نیک اور سالم بچہ پانے کے لیے نطفہ کے انعقاد کے وقت خوش وخرم اور یاد خدا میں مصروف رہنا چاہیے۔

بچوں کی سرشت

انسان کی کچھ صلاحیتیں ایسی ہیں جو پیدا ہوتے ہی اپنا عمل شروع کر دیتی ہیں اور قوت سے فعل کے مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہیں اور کچھ صلاحیتیں مرحلہ قوت ہی میں پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر پیدا ہوتے ہی بچہ کے کھانے پینے کی صلاحیت عملی شکل اختیار کر لیتی ہے اور ماں کی چھاتی سے اپنی غذا حاصل کرنے لگتا ہے اور سیر ہونے تک چھاتی سے چمٹا رہتا ہے۔

لیکن حقیقت فہمی اور علم طلبی وغیرہ جیسی صلاحیتیں مرحلہ قوت میں باقی رہتی ہیں رفتہ رفتہ اور تدریجی طور پر فعلی و عملی مرحلہ میں داخل ہوتی ہیں۔

"اطلبوا العلم من المهد الى اللحد = گود سے گور تک علم حاصل کرو" اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بچہ کی تعلیم و تربیت کا عمل اس کی پیدائش کے وقت ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔

حکایت

دوسری جنگ عظیم میں جرمنی نے فرانس پر قبضہ کر لیا تھا ایک فرانسیسی عورت کو برین آپریشن کی ضرورت پیش آگئی آپریشن کے دوران جب سرجن کا چاقو اس کے مغز سے ٹکرایا تو وہ عورت بے ہوشی کے عالم ہی میں جرمنی کا قومی ترانہ پڑھنے لگی! جب سرجن نے اس کے مغز پر سے چاقو ہٹا لیا تو اس کا ترانہ پڑھنا بھی بند ہو گیا۔ دوبارہ پھر جب

چاتو قریب کیا تو وہ پھر ترانہ پڑھنے لگی۔ ڈاکٹروں کو بہت تعجب ہوا۔ عورت کے ہوش میں آنے کے بعد ان کا تعجب اور بھی بڑھ گیا کیوں کہ وہ عورت جرمنی زبان سے واقف ہی نہیں تھی۔

اس حیرت انگیز و تعجب خیز واقعہ کا جائزہ لینے کے لیے ڈاکٹروں اور ماہرین نفسیات نے ایک کمیٹی تشکیل دے کر تحقیق شروع کر دی۔ طویل تحقیق و جستجو کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ جب جرمن سپاہیوں نے اس عورت کے گھر پر حملہ کیا تھا وہ نومولود بچی تھی۔ جرمن سپاہی اس وقت جو ترانہ پڑھ رہے تھے اس نے اس کے مغز و ذہن پر اثر کیا اور اس کے ذہن میں محفوظ ہو گیا۔

اس واقعہ کی روایتوں سے بھی تصدیق ہوتی ہے کیوں کہ حدیثوں میں ہے کہ جب بچہ پیدا ہو تو اس کے کان میں اذان و اقامت کہنا چاہیے اور "میاں بیوی کو نومولود بچوں کے سامنے بھی ہم بستری یا جنسی چھیڑ چھاڑ نہیں کرنی چاہیے۔ اگر انھوں نے ایسا کیا اور ان کا بچہ بڑے ہو کر زنا کار بن گیا تو انھیں اپنے سوا کسی اور کی ملامت نہیں کرنی چاہیے" ان تعلیمات سے بچوں کے ذہن کی اثر پذیری کا پتہ چلتا ہے۔ بچہ کی تعلیم و تربیت کو اس کی زندگی کے ادوار کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ پیدائش سے سات سال کی عمر تک ۲۔ سات سے چودہ سال کی عمر تک

۳۔ چودہ سال سے شادی ہو جانے تک

اسلام کے تربیتی قوانین

اگر والدین اپنے بچوں کی اچھی تربیت کا اہتمام کریں اور اسلام کے تربیتی قوانین سے آگاہ رہیں اور عملی زندگی میں انھیں بروئے کار لائیں تو وراثت اور مشکوک غذاؤں وغیرہ سے پیدا ہونے والی بہت سی مشکلیں دور ہو سکتی ہیں۔ صحیح اسلامی تربیت، وراثت و مشکوک غذاؤں کے باعث، شقاوت و بدبختی کی ہموار زمین کو ناہموار بنا سکتی ہے یہاں تک کہ خراب ماحول، برے دوست اور لادین استاد کے خطرناک اثرات کا بھی سد باب کر کے انسان کو تباہی و گمراہی سے بچا سکتی ہے۔

بنابریں تربیت، بہت اہم عامل ہے، اور اس پر بہت زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے والدین کا فریضہ ہے کہ وہ اسلامی تربیت کے اصول سیکھ کر بچہ کی زندگی کے مختلف مرحلوں میں ان پر عمل کریں۔

حقیقت جوئی

اس سے قبل یہ اشارہ کیا جا چکا ہے کہ پیدائش کے بعد بچہ کا پہلا فطری تقاضا، بھوک اور سیری کا احساس ہے۔ حقیقت جوئی اور علم طلبی بھی اس کے ابتدائی فطری تقاضوں میں شامل ہے جو بھوک اور سیری کے احساس کے بعد، مرحلہ عمل میں داخل ہوتا ہے۔ والدین کے لیے اپنے بچوں کے فطری تقاضوں کو اچھی طرح سمجھنا ضروری ہے تا کہ وہ اپنی تعلیم کے سایہ میں صحیح اسلامی تربیت کے ذریعہ ان تقاضوں کی تکمیل کر سکیں۔ ان فطری تقاضوں کی صحیح تربیت کا ایک مصداق یہ ہے کہ ہم اس سمت میں قدم بڑھا سکیں ہمارے بچوں کی فطری صلاحیتیں قدرت کے معین کردہ صحیح وقت پر فعلی و عملی مرحلہ میں داخل ہو جائیں اور ان تمام چیزوں سے اجتناب کریں جو غیر طبعی طریقہ سے ان فطری تقاضوں کے پروان چڑھنے کا سبب بن سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر، سن بلوغ تک پہنچے سے پہلے انھیں جنسی مناظر سے دور رکھنا چاہیے۔ ان کے سامنے نہ اس قسم کی گفتگو ہونی چاہیے اور نہ سیکسی فلموں اور تصویروں کے قریب جانے دینا چاہیے۔ کیوں کہ ایسی صورت میں بچے "زود رس بلوغ" کا شکار ہو جائیں گے اور اس کے باعث ان کی بہت سی صلاحیتیں دفن ہو جائیں گی۔ ذہن و حافظہ بھی متاثر ہوگا بہت سی انسانی و روحانی اقدار مٹ جائیں گی۔

اسی لیے ماہرین نفسیات تاکید کرتے ہیں کہ بچوں کے فطری تقاضوں کو اس کے قدرتی وقت سے پہلے متحرک نہیں کرنا چاہیے اور اس کے طبیعی و قدرتی وقت پر بھی اعتدال و توازن سے کام لینا چاہیے۔ بچہ کے نشاط اور شادابی کی ہمیشہ حفاظت کرنی چاہیے تا کہ اس کے فطری تقاضے منحرف یا فنا نہ ہو سکیں۔

مذہب پسندی

ایک اور اہم فطری تقاضا جس پر بچپن ہی سے دھیان دینا چاہیے وہ "مذہب پسندی" ہے آج یہ حقیقت سب پر عیاں ہو چکی ہے کہ انسان کے اندر "مذہب پسندی" نام کی ایک حس موجود ہے جو فطری ہے قرآن مجید نے بھی اس کے فطری ہونے کی تاکید کی ہے۔

لہٰذا والدین پر فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو بچپن ہی سے نماز پڑھنے کا شوق دلائیں۔ البتہ سختی و درشتی سے گریز کرتے ہوئے نرمی و مہربانی سے سمجھانا چاہیے۔ تاکہ بچوں میں خود بخود فطری طور پر نماز پڑھنے کا شوق پیدا ہو۔

حکایت

ایک ڈاکٹر اسلامی مقدسات کی توہین کیا کرتا تھا اور دین و مذہب کے ساتھ بہت برا سلوک کیا کرتا تھا جبکہ اس کی پرورش اسلامی ماحول میں ہوئی تھی۔ تحقیق و جستجو کے بعد یہ راز کھلا کہ اس کی اس "بیماری" کا سرچشمہ اس کے باپ کی بے جا سختی ہے۔

ڈاکٹر کا بیان ہے کہ میرے بابا، ہر روز صبح سویرے چھڑی لے کر میرے سرہانے آتے تھے اور مجھے نماز صبح پڑھنے کے لیے جگاتے تھے۔ اگر اٹھنے میں تھوڑی سی تاخیر ہو جاتی تھی تو پھر چھڑی سے میری چمڑی ادھیڑ دیتے تھے!! اس طرح وہ بچپن ہی سے اپنے باپ کے غلط اور غیر اسلامی طرز عمل کے باعث نفسیاتی بیماری اور دین دشمنی کے کمپلیکس کا شکار ہو گیا اور بڑے ہو کر یہی چیز اسلامی مقدسات سے بدگمانی اور اس کی توہین کرنے کا باعث بن گئی۔

فطری تقاضوں کو پروان چڑھانے کا صحیح طریقہ

بنابریں، فطری تقاضوں کو اگرچہ بچپن ہی سے پروان چڑھانا چاہیے تاہم اس کے لیے غیر اسلامی طریقہ کار نہیں اپنانا چاہیے۔ مثلاً ایک دس برس کے کمزور بچہ کو مئی جون کی گرمی میں ماہ رمضان کے پورے تیس روزے رکھنے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ یہ مذہب

پسندی کے فطری تقاضہ کو پروان چڑھانے کا صحیح طریقہ نہیں ہے بلکہ بچہ کو پیار محبت سے شوق دلا کر تربیت کرنا چاہیے اور اس کے فطری تقاضوں کو صحیح سمت میں آگے بڑھانا چاہیے۔اس کے لیے چند گھنٹوں کا روزہ مفید و مناسب ہے جو بچوں کے درمیان رائج بھی ہے۔اس قسم کے روزہ کے ذریعہ بچہ میں اس عظیم عبادت کا شوق پیدا کر سکتے ہیں اور اس کی مذہبی فطرت کو جلا بخش سکتے ہیں۔

اسی طرح اسے انعام و اکرام سے نواز کر اس کی فطرت کو سنوار سکتے ہیں۔مثلا اگر آپ کے بچہ نے کسی کی پیٹھ پیچھے کوئی بات کہی، کسی کی غیبت کی تو اسے سرزنش نہ کیجئے بلکہ اسے پیار محبت سے سمجھائیے کہ غیبت بری چیز ہے۔

تربیت میں پیار محبت کی اہمیت

واذ قال لقمان لابنه وهو يعظه يا بنى لاتشرك بالله ان الشرك لظلم عظيم

یاد کرو اس وقت کو جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: بیٹا کبھی بھی خدا کا شریک قرار مت دینا کیوں کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

کچھ بزرگوں کا خیال ہے کہ "وهو يعظه" کی قید بظاہر اضافہ ہے لیکن اسے یہ نکتہ بیان کرنے کے لیے اضافہ کیا گیا ہے کہ حضرت لقمان موعظ و نصیحت کے وقت پیار محبت ،نرمی و مہربانی سے کام لیتے تھے۔

بنا بریں اگر ہم اپنے بچوں کی فطری صلاحیتوں اور طبعی تقاضوں کے مرحلہ عمل میں داخل ہوتے وقت صحیح سمت میں ہدایت کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ہمارے بچے بڑے ہو کر مسلمان اور سماج کے لیے مفید بنیں گے۔ورنہ ہمارے بچے ضدی، ہٹ دھرم، متکبر، ظالم اور نفسیاتی کمپلیکس کا شکار ہوں گے اور اس بری تربیت کے برے نتائج کے ہم خود ذمہ دار ہوں گے۔

یزید کے بیٹے پر تربیت کا اثر

یزید بن معاویہ نے تین سال حکومت کی ہے۔پہلے سال میں اس نے سید الشہداء

کو شہید کیا دوسرے سال، مدینہ میں قتل عام کیا۔ اتنے لوگوں کو تہ تیغ کیا کہ مدینہ کی گلیوں میں خون جاری ہو گیا۔ اور اپنی حکومت کے آخری سال میں خانہ خدا میں آگ لگائی۔

یزید کے جہنم واصل ہونے کے بعد، جہلاء اس کے بیٹے کے ارگرد اکٹھا ہو گئے اور اس سے کہا اب تمہیں اپنے باپ کا جانشین بننا چاہیے، اس نے ان لوگوں کی تجویز قبول کر کے مسجد کا رخ کیا۔ یہ سب لوگ مسجد میں جمع ہو گئے۔ ایک عظیم مجمع اکٹھا ہو گیا۔ تمام رؤساء، اشراف، اور قبیلوں کے سردار اور عام افراد جمع تھے۔ اور سب لوگ فرزند یزید کے خطبہ کے منتظر تھے۔ ایسے عالم میں یزید کے بیٹے نے منبر پر جا کر خدا کی حمد وثنا کے بعد کہا: ایھا الناس خدا نے ہمارا تمھارے ذریعہ امتحان لیا اور تمھارا ہمارے ذریعہ......

میرے دادا معاویہ بن ابوسفیان نے خلافت کے سلسلہ میں اس شخص سے اختلاف کیا جو رسول خدا سے قرابت میں ان سے زیادہ حقدار اور اسلام میں ان سے بہتر تھا۔ وہ شخص جو تمام مسلمانوں میں پیش قدم، مؤمن اول، رسول کا ابن عم اور خاتم الانبیاء کے فرزندوں کا باپ تھا۔ جب میرے باپ کے ہاتھوں میں زمام حکومت آئی باوجودیکہ اس سے نیکی کی امید نہیں کی جاسکتی تھی؛ "ہوی وہوس کی سواری پر سوار ہو گیا، اپنے گناہوں کی تاویلیں کرنے لگا، برائیوں کو اچھائی سمجھنے لگا۔"

یہ کہہ کر یزید کا بیٹا (معاویہ بن یزید) رونے لگا اور روتے روتے بولا: ہمارے لیے سب سے زیادہ ناگوار بات یہ ہے کہ ہم سب یزید کی بری موت اور ذلت ورسوائی سے واقف ہیں۔ اس نے عترت پیغمبرؐ کو قتل کیا ان کی بے حرمتی کی، کعبہ کو نذر آتش کیا۔ میں تمھاری حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لائق نہیں ہوں۔ میری نظر میں امام برحق "علی ابن الحسین" ہیں جو مدینہ میں ہیں۔

یہ جملے سن کر یزید کی ماں نے مجمع سے اٹھ کر کہا: اے کاش تم خون کے ٹکڑے میں تبدیل ہو جاتے اور اس دنیا میں نہ آتے تا کہ میں تمہیں اس حال میں نہ دیکھتی۔ معاویہ

بن یزید نے بھی اس کے جواب میں کہا:
ہاں ماں! تم نے سچ کہا! اے کاش میں خون کا ٹکڑا ہوتا اور اس دنیا میں جنم نہ لیتا تا کہ یزید جیسے شخص کا بیٹا ہونے کے ننگ و عار سے بچ جاتا یہ کہہ کر وہ منبر سے نیچے اترا اور ایک گھر میں گوشہ نشینی اختیار کر لی اسے اتنا صدمہ ہوا کہ ۲۳ سال کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا۔

صالح معلم کا کردار

جب لوگوں نے معاویہ بن یزید میں رونما ہونے والی اس تبدیلی کے بارہ میں تحقیق کی تو پتہ چلا کہ اس کا استاد ایک نیک اور صالح انسان تھا جس نے اس کی صحیح تربیت کی تھی اور اسے بدبخت ترین خاندان اور ضلالت و گمراہی کے بدترین راستہ سے کھینچ کر راہ راست پر لگا دیا تھا یہ واقعہ بہترین گواہ ہے کہ صحیح اسلامی تربیت، حرام نطفہ، حرام غذا، گندے ماحول اور گناہ گار ماں، ماں باپ کے مضر اثرات کو زائل کر سکتی ہے۔

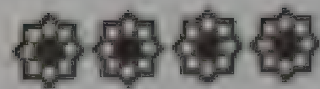
اعتدال کی رعایت

یہ نکتہ بھی مدنظر رہنا چاہیے کہ اگر چہ بچوں کے فطری تقاضوں کو کنٹرول اور پروان چڑھاتے وقت پیار و محبت اور انعام و اکرام سے کام لینا چاہیے۔ لیکن اس بات کا بھی پورا خیال رکھنا چاہیے کہ اس سلسلہ میں افراط نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا نتیجہ بھی تشدد آمیز برتاؤ جیسا ہو سکتا ہے۔

یعنی اگر کسی بچہ کو حد سے زیادہ ناز و نعم میں پالا جائے گا تو اس میں تکبر و غرور، خود پسندی کا جذبہ اور استبداد و مطلق العنانی کی خصلت پیدا ہو جائے گی۔ پیار، محبت، نرمی اور مہربانی کی ایک حد ہوتی ہے بے جا و بے حساب پیار و محبت کے نتیجہ میں آپ کا بچہ نہ صرف یہ کہ سماج کے لیے مفید فرد نہ بن سکے گا بلکہ سماج پر بوجھ بن جائے گا۔

بہترین تربیت، عملی تربیت ہے۔ جب انسان اپنے گھر میں خود انسانی و اسلامی اقدار کا لحاظ رکھے گا گھر کے تمام افراد کے حقوق کا احترام کرے گا۔ اطمینان و حضور قلب کے ساتھ اول وقت نماز پڑھے گا۔ بے جا مذاق اور بیہودہ باتوں سے اجتناب کرے گا۔

غیبت نہیں کرے گا۔ جھوٹ نہیں بولے گا۔ بدزبانی اور بدکلامی نہیں کرے گا۔ لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق کا مظاہرہ کرے گا تو قدرتی طور پر گھر کے تمام افراد خاص طور سے بچے اس کی عملی تربیت سے متاثر ہوں گے۔ اس قسم کی تربیت کامیاب ترین اور بہترین تربیت ہے۔



ولایت تشریعی

جناب جوادی آملی

گذشتہ قسطوں میں بتایا جاچکا ہے کہ ولایت، خداوند تبارک وتعالیٰ کی ذات میں منحصر ہے۔اس انحصار پر دلالت کرنے والی آیتوں میں یہ آیتیں بھی شامل ہیں:

"إن الحکم إلا للّٰه. (انعام:۵۷)"

"فاللّٰه هو الولی. (شوریٰ:۹)"

اسی طرح یہ بھی بیان کیا جاچکا ہے کہ خداوند تبارک وتعالیٰ کی ذات میں ولایت کے انحصار کے باوجود قرآن کریم میں کچھ دوسرے حکمرانوں اور والیوں کا بھی ذکر ملتا ہے جیسے یہ آیتیں:

"انّما ولیّکم اللّٰه و رسوله و الذین آمنوا الذین یقیمون الصلوٰة و یؤتون الزکوٰة و هم راکعون.(مائده:۵۵)"

تمہارے ولی صرف اللہ، اس کا رسول اور وہ مومنین ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوۃ دیتے ہیں۔

"فما یکذّبک بعد بالدین. الیس اللّٰه باحکم الحاکمین(.تین:۷/۸)"

پھر تم کو روز جزا کے بارے میں کون جھٹلا سکتا ہے۔کیا خدا سب سے بڑا حاکم نہیں ہے۔

"و ان کان طائفة منکم آمنوا بالذی أرسلتُ به و طائفةٌ لم یؤمنوا فاصبروا حتی یحکم اللّٰه بیننا وهو خیر الحاکمین.(اعراف:۸۷)"

اور اگر تم میں سے ایک جماعت میرے لائے ہوئے پیغام پر ایمان لے آئی اور ایک

ایمان نہیں لائی تو ٹھہرو یہاں تک کہ خدا ہمارے درمیان اپنا فیصلہ صادر کردے کہ وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

مذکورہ آیتوں کے ظاہری اختلاف کو برطرف کرنے کے لئے گذشتہ مقالات میں یہ عرض کیا جاچکا ہے کہ "خیر الحاکمین: بہترین فیصلہ کرنے والا" اور "احکم الحاکمین: سب سے بڑا حاکم" کی تعبیر اگر چہ متعدد حکمرانوں کے وجود پر دلالت کرتی ہے لیکن یہ حکومتیں اگر عدل وانصاف کی بنیاد پر استوار ہوں تو یہ سب حکومت حق وحکومت اللہ کی مظہر وآئینہ دار ہیں اور ان سب کی بازگشت، خداوند تبارک وتعالیٰ کی طرف ہے۔ اور اگر ظلم وستم کی بنیاد پر قائم ہوں تو یہ حکومتیں ناجائز وغیر قانونی حکومتیں ہوں گی جن کی طرف ان آیاتوں میں اشارہ کیا گیا ہے جن میں غیر الٰہی حکومتوں کی نفی کی گئی ہے جیسے

"و من لم یحکم بما انزل اللہ فاؤلئک هم الکافرون. (مائدہ: ۴۴)"

جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق حکومت نہیں کرتے وہی کافر ہیں۔

"و من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک هم الظالمون. (مائدہ: ۴۵)"

جو لوگ خدا کے نازل کردہ حکم کے مطابق حکومت نہیں کرتے وہی لوگ ظالم ہیں۔

"و من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک هم الفاسقون. (مائدہ: ۴۷)"

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق حکومت نہیں کرتے وہی فاسق ہیں۔

خداوند سبحان کی حاکمیت پر دلالت کرنے والی آیتوں میں سے ایک آیت سورہ نساء کی یہ ۵۹ ویں آیت ہے۔

"یا ایها الذین آمنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم فان تنازعتم فی شئی فردوه الی اللہ و الرسول ان کنتم تؤمنون باللہ و الیوم الآخر ذلک خیر و احسن تاویلا"

اے ایمان لانے والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول وصاحبان امر کی اطاعت کرو جو تم ہی میں سے ہیں پھر اگر آپس میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو اسے خدا اور رسول کی طرف پلٹا دو اگر تم اللہ وروز آخرت پر ایمان رکھنے والے ہو۔ یہی تمھارے حق میں خیر اور انجام کے اعتبار سے بہترین بات ہے۔

جیسا کہ گذشتہ قسطوں میں اس آیت کے متعلق تفصیل سے عرض کیا جاچکا ہے کہ اگر چہ یہ آیت ابتداء میں تین حکومت اور تین حکمرانوں کی طرف اشارہ کررہی ہے لیکن فوراً ہی اس کا رخ

معنویت اور پھر وحدانیت کی طرف مڑ گیا ہے۔ اس وقت جس چیز کی وضاحت مقصود ہے وہ یہ ہے کہ آیت دو قسم کی اطاعت پر دلالت کر رہی ہے کیونکہ آیت کے صدر میں اطاعت کا فعل امر، لفظ ''اطیعوا'' دو مرتبہ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ اللہ کی اطاعت، رسول و صاحبان امر کی اطاعت جیسی نہیں ہے دونوں اطاعتوں کی سنخ جدا ہے۔ اگر دونوں اطاعتیں ایک ہی طرح اور ایک ہی سنخ کی ہوتیں تو پھر لفظ ''اطیعوا'' کو دو بار بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی اور اس تکرار کا کوئی دوسرا جواز بھی نہیں ہے۔ اسی طرح رسول و صاحبان امر کی اطاعت کے درمیان ''اطیعوا'' کو مکرر بیان نہ کرنا بھی دلیل ہے کہ ان دونوں کی اطاعت ایک جیسی ہے۔ رسول کی اطاعت اور صاحبان امر کی اطاعت دونوں کا تعلق ایک ہی سنخ سے ہے۔ کیونکہ اگر ان دونوں کے درمیان کسی قسم کی مغایرت ہوتی تو یقیناً لفظ ''اطیعوا'' کی تکرار بھی ہوتی۔

مذکورہ بالا بیان کی روشنی میں یہ بات صاف ہو گئی کہ رسول و صاحبان امر کی اطاعت کی ایک سنخ ہے اور خدا کی اطاعت کی دوسری سنخ ہے۔

رسول در حقیقت دو منصب کا حامل ہوتا ہے، ایک منصب رسالت اور دوسرا منصب ولایت۔ منصب رسالت کے لحاظ سے آپ کی ذمہ داری صرف خدا کا پیغام لوگوں تک پہچا دینا ہے اور آپ کے پہچائے ہوئے پیغام پر عمل، در حقیقت خدا کی اطاعت ہے۔ کیونکہ آپ نے صرف اللہ کا حکم ہی لوگوں تک پہچایا ہے۔

لیکن والی و حاکم مسلمین ہونے کے ناطے، الٰہی احکام و قوانین کے نفاذ کے سلسلہ میں کچھ مخصوص احکام و فرامین بھی جاری کرتے ہیں جن کی پیروی بھی تمام مسلمانوں پر فرض ہے ان دونوں قسم کے احکام کی اطاعت میں پایا جانے والا فرق لفظ ''اطیعوا'' کی تکرار کا باعث بنا ہے۔

رسول کے ہمراہ اولوالامر کا ذکر اور ایک کا دوسرے پر عطف، اولوالامر کی قیادت و ولایت اور مسلمانوں پر ان کی حکمرانی کی دلیل ہے۔ اور اولوامر کی مطلق اطاعت کے حکم کا لازمہ ان کا خطاو لغزش سے محفوظ و معصوم ہونا ہے۔ گذشتہ قسط میں اسے تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔

اس آیت سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ رسول اکرمؐ و معصومین علیہم السلام کی ولایت کا ایک حصہ، براہ راست و واقعاً ولایت ہے اور ایک حصہ بظاہر ولایت ہے لیکن در حقیقت صرف پیغام رسانی ہے۔ کیونکہ انبیاء و ائمہ علیہم السلام کی تشریعی ولایت کی بازگشت ''ولایۃ التشریع'' کی طرف ہے۔ انبیاء و ائمہ کو قانون سازی کا حق نہیں ہے بلکہ ان کا کام الٰہی قانون کی تبلیغ و تشریح اور اس کے نفاذ کی نگرانی ہے وہ تشریع پر ولایت رکھتے ہیں تشریع کی ولایت نہیں رکھتے

یہ ولایت ذات باری تعالیٰ سے مخصوص ہے۔
کیونکہ اگر پیغمبر کو قانون سازی کا حق ملا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ زندگی کے دوسرے عام اور معمول کے مسائل کی طرح قانون سازی بھی آپ کے اختیار میں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ یہ قوانین، خداوند عالم سے وحی والہام کے ذریعہ حاصل کر کے عوام تک پہچاتے ہیں۔ احکام و قوانین کا خدا سے حصول کبھی قرآن کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور کبھی حدیث قدسی کی شکل میں۔ پیغمبر نے، جو احکام پہلی شکل میں حاصل فرمائے ہیں وہ وحی کا عنوان رکھتے ہیں اور "فرض اللہ" کہلاتے ہیں اور جو احکام حدیث قدسی وغیرہ کی شکل میں آپ کو الہام ہوئے ہیں وہ "فرض النبی" کہلاتے ہیں۔ دونوں ہی صورتوں میں نبی اور حکم تشریعی کو بیان کرنے والے کا کام صرف ان احکام کو پہچادینا ہے اس منزل میں اس کی حیثیت ایک قاصد و رسول اللہ سے زیادہ نہیں ہے ان قوانین میں اپنی طرف سے کچھ اضافہ کر سکتا ہے نہ کم۔ اس کا کام ولی تشریع کے بنائے ہوئے قوانین کو امت مسلمہ تک پہچادینا ہے۔
قوانین و پیغام الٰہی پہچانے میں آنحضرتؐ کی عصمت پر یہ آیت گواہی دیتی ہے:
"و ما ینطق عن الهویٰ ان هو الا وحی یوحیٰ (نجم/ ۳و ۴)
اس آیت کی تشریح کے سلسلہ میں پہلے بھی یہ بتایا جاچکا ہے کہ اس آیت میں "نطق" سے مراد صرف بولنا نہیں ہے۔ بلکہ اس میں نبی کا قول، فعل، تقریر یوری سیرت شامل ہے۔ سیرت کے لئے نطق کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ انسان کا سب سے نمایاں اثر نطق ہی ہوتا ہے۔ ایسی ہی تعبیر سورۂ "ق" کی اس آیت میں بھی ہے:
"ما یلفظ من قولٍ الّا لدیه رقیب عتید (ق/ ۱۸)
فرشتہ کی ذمہ داری، صرف دہن سے نکلنے والے الفاظ ہی کا حساب رکھنا نہیں ہے بلکہ قول کے ساتھ ساتھ وہ عمل کا بھی حساب رکھتا ہے حالانکہ اس آیت میں صرف گفتگو ہی کا تذکرہ ہے کیونکہ گفتگو انسان کا سب سے نمایاں اثر ہوتا ہے۔
پس انبیاء کی تشریعی ولایت، ان کی رسالت کے کام سے جدا نہیں ہے۔ بلکہ عین رسالت و نبوت ہے۔

ولایت کی قلمرو، حکومت و سرپرستی کے معنی میں

تشریعی ولایت اور حکومت و سرپرستی کے معنی میں ولایت کے درمیان فرق بیان کرنے اور یہ جاننے کے بعد کہ "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اُولی الامر منکم" میں اطاعت کا حکم ابتدا میں تشریعی ولایت کے سلسلہ میں ہے پھر اس کے بعد حکومت و سرپرستی

کے معنی میں ولایت کے سلسلہ میں ہے۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انبیاء و ائمہ ھدیٰ علیھم السلام کی ولایت کی قلمرو اور دائرہ اختیار کیا ہے؟ کیونکہ جب تشریعی ولایت ان کے دائرہ اختیار سے باہر نکل گئی تو تمام تشریعی احکام وقوانین جن کا تعلق انسانی افعال سے ہے حکومت وسرپرستی والی ولایت کے دائرہ سے خود بخود خارج ہو گئے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ انبیاء و اولیاء کی ولایت کے دائرہ میں کلی قوانین کا نفاذ، جزئیات پر ان کلی قوانین کی تطبیق اور قوانین کے نفاذ پر نگرانی کے لئے افراد کا تقرر کرنا ہے۔ اسی تدبیری وتنظیمی مجموعہ کو حکومت وسرپرستی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

پس حکومتی ولایت کا دائرہ عمل، قوانین کے نفاذ تک محدود ہے۔ اس میں قانون سازی شامل نہیں ہے۔ کیونکہ قانون سازی، تشریع کی ولایت ہے، جو خداوند عالم سے مخصوص ہے۔ رسالت کا کام خدا کے بنائے ہوئے قوانین کو پہچانا ہے اور حکومت کا کام ان قوانین کو نافذ کرنا ہے۔ ائمہ جمعہ وجماعات کا تقرر، زکوۃ وصول کرنے والے عاملوں کا تعین۔ سرحدوں اور حکومتوں کی حفاظت کے لئے فوج کی تیاری، داخلی اور خارجی تعلقات کی نگرانی اور سیاسی، ثقافتی، اقتصادی، فوجی شعبوں سے متعلق سینکڑوں منصوبوں اور اقتصادی امور کی دیکھ بھال۔ یہ سب حکومتی ولایت کے قلمرو میں شامل ہے۔

البتہ اس حکومتی ولایت کے ذمہ دار اور حاکم وولی کے تقرر کا حق بھی صرف خدا کو ہے اور خدا جس شخص کو ولی امر کی حیثیت سے مقرر کردے اس پر اس عہدہ کو قبول کرنا فرض ہے۔

حکومتی وثانوی حکم

ذکر کیا جا چکا ہے کہ حکومتی ولایت بھی خود ایک الٰہی حکم ہے اور دیگر احکام کی طرح اس کا اختیار بھی خدا ہی کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہے یہ ولایت عطا کر سکتا ہے۔ جس طرح خداوند عالم نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ جیسے عناوین کے لئے حکم وجوب مقرر فرماتا ہے اسی طرح اشخاص کے لئے ولایت وسرپرستی کا عہدہ مقرر فرماتا ہے۔ کبھی وہ یہ عہدہ افراد کے لئے بطور خاص مقرر فرماتا ہے جیسے کسی معین شخص کی امامت ونبوت اور کبھی بطور عام مقرر کرتا ہے جیسے باپ دادا کی ولایت یا وصی کی ولایت۔

مذکورہ تمام موارد میں تقرر ولایت، ایک شرعی واوّلی حکم ہے۔ کیونکہ حکم ثانوی، ایک ایسا حکم شرعی ہے جو خاص اور استثنائی مقام پر ان امور کے لئے معین ہوتا ہے جن کا سابق میں کچھ اور حکم تھا جیسے ضرورت کے وقت مردار کھانے کا جواز۔ کیونکہ ضرورت واضطرار نہ ہونے کی

صورت میں اس کا کھانا حرام تھا اس کا حکمِ اوّلی، حرمت ہے۔

"فمن اضطرّ غیر باغٍ ولا عادٍ فلا اثم علیه. (بقرہ/۱۷۳)

اگر کوئی مضطر ہو جائے اور حرام کا [illegible] بھی نہ ہو اور ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے والا بھی نہ ہو تو اس کے لئے کوئی گناہ نہیں ہے۔

لیکن ولایت، حکمِ اوّلی ہے۔ مثال کے طور پر باپ [illegible] بیٹے پر جو ولایت رکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پہلے اس کی ولایت منع تھی بعد میں از[illegible]ے ضرورت اسے یہ ولایت دے دی گئی۔ ولایت نام کا ایک نیا حکم، ثانوی حکم کے طور پر مقرر کر دیا گیا۔ "ابوّت" اور باپ ہونا شروع ہی سے ولایت کا حقدار تھا۔

حاکم کی حکومت بھی باپ اور دادا کی ولایت کی طرح حکمِ اوّلی ہے۔ سماج کے سرپرست و حاکم کی ولایت اور دوسرے افراد کی ولایت میں فرق، دائرۂ عمل اور قلمرو کے لحاظ سے ہے۔ مثلاً باپ دادا کی ولایت کا دائرۂ عمل، صغیر و نابالغ بچہ کے مصالح و مفادات کی حفاظت تک ہے۔ یا بالغ و باکرہ لڑکی پر باپ کی ولایت کی قلمرو صرف نکاح وغیرہ تک ہے۔

لیکن ائمہ معصومین اور پیغمبر علیہم السلام کی ولایت کی قلمرو اسلام و مسلمین کے مصالح و مفادات کی حفاظت ہے۔ کیونکہ وہ اسلام کے بھی ولی ہیں اور مسلمانوں کے بھی۔ اسلام سے مراد قوانین کا وہ مجموعہ ہے جو غدیر خم میں ولایت کی تعیین و تشریع اور اعلان کے بعد اپنی حد کمال کو پہنچ گیا لہٰذا اب اس کے بعد کسی عام کو تخصیص کرنے یا کسی مطلق کو مقید بنانے یا کسی حکم کو منسوخ کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی۔ اب اسلام کے واجبات، مستحبات، محرمات، مکروہات و مباحات میں کوئی اضافہ ہوگا اور نہ کمی۔ اگر اس کے بعد ائمہ ہدیٰ بھی کسی تخصیص یا کسی تقیید کا ذکر کریں گے تو وہ رسالت کی وراثت اور پیغمبر اکرمؐ پر خدا کے نازل کئے ہوئے قوانین کی تبیین و تشریح کے عنوان سے ہوگا ورنہ اب نہ کسی مستحب کے اضافہ کی گنجائش ہے اور نہ کسی مکروہ کو کم کرنے کا امکان۔

اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت کا مطلب، نفاذ و عمل کے میدان میں مذکورہ بالا الٰہی قوانین کی حفاظت ہے۔ اسلام کے وسیع قوانین، جب تک ایک قانونی مجموعہ میں مدوّن شکل میں لفظی یا تحریری شکل میں باقی رہیں گے انھیں کسی قسم کی مخالفت و مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ لیکن جب انھیں میدان عمل میں لایا جائے گا تب مخالفت و مزاحمت کے مرحلہ سے گزرنا پڑے گا کیونکہ عالم طبیعت، عالم تضاد و تزاحم ہے۔ یہاں لوگوں کے مفادات

ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ لہٰذا ولی مسلمین کی ذمہ داری ہے کہ اسلامی احکام وقوانین کی حفاظت اوران کا دفاع کرتے ہوئے نفاذ کے وقت پیش آنے والی مشکلات اورالٰہی احکام کے آپسی ٹکراؤ کو جملہ الٰہی قوانین سے اپنی واقفیت اوراسلامی احکام کے پس منظر سے آگہی کے سہارے، برطرف کرے اورآخرکار اہم کو مہم پر ترجیح دیتے ہوئے اہم کو نافذ کرنے کا حکم دے۔ یہ عمل، نہ تخصیص ہے نہ تقیید اور نہ ہی گذشتہ حکم کی منسوخی یا حکم کی تبدیلی۔ کیوں کہ تخصیص، تقیید، نسخ اور تبدیلی وغیرہ کا تعلق دلائل کے ذریعہ اصل حکم کے اثبات سے ہے۔ یہاں گفتگو حکم کے اثبات کی نہیں ہے حکم کو ثابت شدہ مان کر صرف اس کے نفاذ کے وقت میدان عمل میں اہم کو مہم پر ترجیح دینا ہے اور یہ ایک عمومی قاعدہ ہے جس کی رعایت تمام مسائل میں، خداوند عالم کے ناقابل تغییر قوانین کی حفاظت کے لئے ضروری ہے۔ چاہے وہ شخصی وذاتی مسائل ہی کیوں نہ ہوں۔

مثال کے طور پر کسی ڈوبتے ہوئے انسان کو نجات دینا واجب ہے اور کسی کی زمین پر سے اس کی اجازت کے بغیر عبور کرنا حرام ہے یہ دونوں شرعی حکم ہیں اور یہ دونوں احکام اس وقت ایک دوسرے سے مزاحم ہوتے ہیں جب ڈوبتے ہوئے انسان کو بچانا دوسرے کی زمین سے گذرے بغیر ممکن نہ ہو۔ ان دونوں احکام میں سے کسی ایک ہی پر عمل ہوسکتا ہے ایک پر عمل کرنے کا لازمہ دوسرے کو ترک کرنا ہے۔ جان بچانے کے وجوب پر عمل کرنے کے لئے، ملکِ غیر سے عبور کرنے کی حرمت کو نظرانداز کریں گے اور ملکِ غیر سے عبور کی حرمت کے قانون کا احترام کرتے ہوئے جان بچانے کے وجوب کو ترک کریں گے۔ ایسے مقامات پر جہاں کسی ایک حکم کو نظرانداز کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ہے وہاں اہم حکم پر عمل کیا جائے گا اور مہم کو اہم پر قربان کردیا جائے گا۔ لیکن قربان کردینے کا مطلب، حکم کی تبدیلی ہرگز نہیں ہے۔ کیوں کہ جان بچانے کے لئے مالک کی اجازت کے بغیر اس کی زمین سے گزر جانے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ غصب کی حرمت کا قانون منسوخ کردیا گیا ہے۔ حرمت کا قانون اپنی جگہ پر موجود ہے بس اس مجبوری کے عالم میں خدا اس حرام کے ارتکاب کی سزا نہیں دے گا۔

سماجی مسائل کی بھی یہی صورت حال ہے۔ حاکم کو کسی قانون کو گھٹانے یا بڑھانے کی اجازت نہیں ہے۔ اسے تمام الٰہی احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرکے خدا کا

خالص بندہ ہونے کا ثبوت دینا ہے۔ البتہ الٰہی قوانین کے امین اور ولی ہونے کی حیثیت سے اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ قوانین کے نفاذ اور ان پر عمل کرے۔ وقت اگر اہم اور مہم کے درمیان مزاحمت اور ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو جائے خصوصاً اگر کوئی قانون، اسلامی نظام کی بقاء سے متصادم ہو جائے تو وہ اہم کو فوقیت دے اس پر عمل کرائے اور جب تک تصادم اور مزاحمت کی صورت باقی ہے مہم سے دست بردار ہو جائے۔ لہٰذا جب حاکم اور سماج کا ولی کسی اہم قانون کے نفاذ کا حکم دیتا ہے تو اس حکم کی اطاعت واجب ہے۔ اور اس سلسلہ میں حاکم اور سماج کے دیگر افراد میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ اسلامی نظام میں کوئی شخص یا کوئی معین فرد، حکومت نہیں کرتی بلکہ یہ اسلام ہے جو حکومت کرتا ہے۔

تشریعی و حکومتی احکام اور ثبات و تغیر کا دائرہ

ہر انسان دو حالت رکھتا ہے، ثابت اور متغیر۔ ثابت حالت کا تعلق، انسان کی توحیدی فطرت اور اس کی روح سے ہے جو مادّہ سے مجرد اور ماضی و مستقبل کی سرحدوں سے آزاد ہے:

"فطرۃ اللّٰہ التی فطر الناس علیہا لاتبدیل لخلق اللّٰہ (روم/۳۰)
وہ الٰہی فطرت جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اور خدا کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔

جو قوانین، انسان کی روح، اور اس کی ثابت و دائمی حالت کے مطابق بنائے جاتے ہیں اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لیکن انسان کی متغیر حالت اس کے جسم اور اس کے مزاج سے مرتبط ہوتی ہے جس کا تعلق زمین و زمان سے ہے۔ انسانی حالات و کیفیات کے اسی بدلتے ہوئے شعبہ میں مختلف علاقوں یا مختلف زمانوں میں زندگی بسر کرنے والوں کے درمیان رنگ برنگے رسم و رواج اور طور طریقہ ایجاد ہوتے ہیں۔

جن قوانین کا تعلق، فطرت انسان کی تربیت سے ہے، وہ وہی تشریعی قوانین ہیں

۱۔ اصول کافی کتاب فضل العلم باب البدع والرای والمقاییس حدیث ۱۹

جو کسی حال میں تبدیل نہیں ہوتے اور کسی بھی شخص کو انھیں بدلنے کا حق نہیں ہے اسی قسم کے قوانین کے دوام و بقاء کے سلسلہ میں فرمایا ہے:

"حلال محمد حلال ابدا الیٰ یوم القیامة و حرامه حرامٌ ابداً الیٰ یوم القیامة"

حلال محمدؐ، قیامت تک حلال ہے اور حرام محمدؐ، قیامت تک حرام ہے۔

لیکن وہ قوانین جو انسان اور نیچر کے باہمی تعلق کی کیفیت کو متعین کرتے ہیں انھیں، ناقابل تغییر، ابدی قوانین کے نفاذ کی کیفیت کی طرف پلٹایا جائے گا۔ کیوں کہ مذکورہ قوانین کے نفاذ کے وقت ہی احکام کے درمیان ٹکراؤ کے حالات اور دشمنوں سے مقابلہ کے شرائط پیدا ہوتے ہیں۔ ابدی و دائمی قوانین کو بدلتے ہوئے سماجی حالات پر منطبق کرتے وقت رابطہ کی کڑی کا نام ولایت بمعنائے حکومت و سرپرستی ہے جسے تشریع کا حق رکھنے والے ولی نے اپنے تشریعی ارادہ کے ذریعہ مقرر کیا ہے۔

پہلے بھی یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ جس طرح سے بچہ پر باپ کی ولایت کا تقرر اوّلی و الٰہی حکم ہے اسی طرح اسلامی معاشرہ کے رہنماؤں اور ذمہ داروں کی ولایت کا تقرر، اوّلی و الٰہی حکم ہے۔ اسی الٰہی حکم کے طفیل میں، اسلامی حکمراں اقتصادی، سیاسی اور عسکری میدانوں میں ابدی الٰہی قوانین کے نفاذ اور موجودہ حالات پر ان اسلامی قوانین کی تطبیق کے لئے اقدام کر سکتا ہے۔ اسے اسلامی قوانین کے حدود میں۔ جنگلوں دریاؤں، اور معادن وغیرہ سے متعلق امور کی دیکھ بھال مختلف اقوام و ملل سے تعلقات کی تنظیم اور حملہ آور دشمنوں کے مقابلہ میں فوج کی تشکیل نیز اسلحوں کی فراہمی وغیرہ کے لئے اقدام کرنے کا حق حاصل ہے۔

جس طرح اللہ نے ہر انسان کو یہ اجازت عطا فرمائی ہے کہ جب کبھی مقام عمل میں کوئی "مہم حکم" کسی "اہم حکم" سے ٹکرا جائے تو وہ اپنی شرعی حد میں رہتے ہوئے "اہم حکم" کے نفاذ کی خاطر "مہم حکم" کو ترک کر سکتا ہے۔ اسی طرح اس اسلامی حکمراں کو بھی یہ

حق ہے کہ اہم حکم کی خاطر مہم حکم کو اس وقت تک کے لئے معطل رکھ سکتا ہے جب تک یہ مزاحمت اور ٹکراؤ برقرار ہے۔ اور اس کے لئے کسی تقیید، تخصیص یا نسخ وغیرہ کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

اسلامی حکمراں، سماجی تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے الٰہی احکام کے نفاذ کی غرض سے مختلف قسم کے متغیر احکام صادر کرسکتا ہے اور یہ سارے احکام، اولی الامر کے احکام کی اطاعت کے وجوب پر مبنی، الٰہی حکم اولی کے لئے زمین ھموار کرتے ہیں۔ یعنی جس طرح سے، اولاد پر باپ کی ولایت اور اسے حکم دینے کا حق، الٰہی حکم کے لئے موضوع ہے اسی طرح اسلامی حکمراں کے اوامر ونواہی بھی حکم خدا کا موضوع ہیں۔ فرق یہ ہے کہ خداوند عالم نے باپ کے صرف ان احکام کی اطاعت اولاد پر واجب قرار دی ہے جن کی نافرمانی باپ کی اذیت کا باعث ہوتی ہے۔ اس کی ولایت کا دائرہ محدود ہے جبکہ اسلامی حکمراں کی ولایت کا دائرہ اتنا تنگ نہیں ہے۔



اسلام میدان جنگ میں

جناب علی حجتی کرمانی

یہاں اسلامی جہاد کی علت و اسباب کی مکمل تحقیق مقصود نہیں ہے بلکہ ہم صرف میدان جنگ میں اسلامی تصویر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ جو آئین زندگی' انسانوں کے لئے "صلح وسلامتی" کا تحفظ لے کر آیا تھا اجمالی طور پر ہم میدان کارزار میں بھی اس کی حیرت انگیز رحم وترحم کی تصویر پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ابتداء میں تین بنیادی نکتوں پر غور کرنا ضروری ہے۔

ا۔ جو مکاتب فکر، مکمل طور پر جنگ کی مخالفت کرتے ہیں وہ عالم خیال میں کھوئے ہوئے ہیں۔ صحیح آئیڈیالوجی کی پہچان یہ ہے کہ وہ صلح کے ان مقامات کی تعیین کرے جہاں یہ موجب سعادت وفلاح بشریت ہے۔

ہر برحق مکتب فکر اور نئی آئیڈیالوجی جو حق وعدالت کی منادی اور عملی اثرات کی حامل ہوگی جب بھی کسی ایسے گروہ کے مقابلہ پر آئے گی جو ناحق طور پر کسی عہدہ ومنصب پر قبضہ کر کے قوموں کو غلام بنا کر ان کا استحصال کرنا چاہتا ہو تو وہ ان لوگوں سے لڑنے کے لئے مجبور ہو جائے گی جو آئین حق سے ٹکرانا چاہتے ہیں یہ ایک بڑی کھلی ہوئی بات ہے۔

۲۔ اسی وجہ سے آئین زندگی، مکتب حق، اور منادی عدالت، اسلام نے جنگ کا

بھی رخ پیش کیا ہے اور اپنے پیروکاروں کو جہاد کا حکم دیا ہے۔ لیکن یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جنگ کبھی بھی اصلی مقصد نہیں رہا ہے۔ بلکہ اسلام میں صلح و دوستی، نیک سلوک اور مسالمت آمیز رویہ ہی ہمیشہ بنیاد اور ہدف رہا ہے۔ صرف استثنائی جگہوں پر وجود کی حفاظت اور مخالف کی گزند سے صلح وسعادت بشری کے تحفظ کی خاطر مخصوص اور صدفی صد انسانی حدود و شرائط کے ساتھ اس جنگ کو لازم وضروری جانا ہے۔

۳۔ گزشتہ بحثوں میں ہم یہ بات بتا چکے ہیں کہ مسالمت آمیز اور میل جول والی زندگی کا جتنا وسیع نظریہ اسلام میں پایا جاتا ہے کسی اور شریعت میں یا سماجی دبستان میں اتنے وسیع نظریہ کا سراغ نہیں ملتا ہے۔

محبت اور انسان دوستی اس مقدس آئین کے ارکان اور بنیادیں ہیں اسلام نے بقاء باہمی، عفو و اغماض اور چشم پوشی کو اس حد تک اہمیت دی ہے کہ اسلام کے حکم کے مطابق اگر کوئی شخص، صلح وسلامتی کے ساتھ آجائے اور دوستی ومسالمت کا رویہ پیش کرے تو اسے مومن سمجھنا چاہئے۔ ارشاد ہوتا ہے:

ولا تقولوا لمن القیٰ الیکم السلم لست مومناً ۔ اور جو تمہارے سامنے صلح وآشتی کی پیشکش کرے تم یہ نہ کہو کہ تم ایمان دار نہیں ہو!

مندرجہ ذیل آیات میں اسلام کی رحمت، خیر، اور انسان دوستی کی تصویر صاف نمایاں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

یا ایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ۔۲ ۔ اے ایمان لانے والوں سب کے سب صلح وآشتی میں وارد ہو جاؤ

وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین ۔ ۳ ۔ ہم نے آپ کو عالمین کے لئے صرف رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

ان طائفتن من المومنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما ۴ ۔
اگر مومنین میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان دونوں میں صلح کرادو۔

ولیعفوا ولیصفحوا الا تحبّون أن یغفر اللّٰہ لکم ۵۔
معاف کردیں اور درگذر کریں کیا وہ یہ نہیں چاہتے کہ خدا انہیں معاف کردے
ولا تزال تطّلع علی خائنۃ منھم الّا قلیلاً منھم فاعف عنھم واصفح انّ اللّٰہ یحبّ المحسنین ۶۔
(اے رسول) چند آدمیوں کے سوا ایک نہ ایک کی خیانت پر ہمیشہ مطلع ہوتے رہیں گے، تو آپ ان کو معاف کردیجئے اور ان سے درگذر کیجئے کیوں کہ خدا نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔
فاصفح عنھم و قل سلٰم ۷۔ ان سے منھ پھیر لو اور کہہ دو کہ تم کو سلام
و ان جنحوا للسّلم فاجنح لھا و توکّل علی اللّٰہ ۸۔
جب وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی موافقت کرو اور خدا پر توکل کرو
فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم و القوا الیکم السّلم فما جعل اللّٰہ لکم علیھم سبیلاً ۹
چنانچہ اگر وہ تم سے کنارہ کشی کریں اور جنگ کو موقوف کردیں اور صلح کا پیغام بھیجیں تو ان کے خلاف خدا نے تمہارے لئے کوئی راستہ نہیں قرار دیا ہے (یعنی تم کو تعرض کی اجازت نہیں ہے)
اسلام میں صلح و آشتی کا دامن بہت وسیع ہے یہاں تک کہ اس نے جنگ نہ کرنے والوں، آزار نہ پہچانے والوں اور مسلمانوں کو ان کے شہر سے نہ نکالنے والوں سے دوستی اور نیکی کی اجازت دی ہے۔
لا ینھٰکم اللّٰہ عن الّذین لم یقاتلوکم فی الدّین و لم یخرجوکم من دیارکم ان تبرّوھم و تقسطوا الیھم انّ اللّٰہ یحبّ المقسطین ۱۰۔
اور جو لوگ تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑتے اور نہ انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے۔ ان کے ساتھ احسان کرنے اور انصاف سے پیش آنے سے خدا تمہیں منع نہیں کرتا۔ بے شک خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

مخاصمانہ رویہ اختیار اور دشمنی کا اظہار کرنے والوں کے ساتھ بھی مسلمانوں کو غیر عادلانہ روش اپنانے اور ظلم و تعدی سے کام لینے کی اجازت نہیں دی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

لا یجرمنکم شنان قوم ان صدوکم عن المسجد الحرام ان تعتدوا [11]

جن لوگوں نے مسجد الحرام سے تمہیں روکا ہے تمہارے لئے ان کی دشمنی ان پر ظلم کرنے کا سبب نہ بنے۔

مذکورہ بالا آیات کے مجموعہ، کچھ حدیثوں (جن کی طرف اشارہ کیا جائے گا) اور کتاب جہاد میں فقہائے اسلام کے تحریر کردہ قوانین کے مطالعہ سے مندرجہ ذیل اصول کا استفادہ ہوتا ہے۔

ا۔ صلح اور انسانی قدر مشترک پر تکیہ کرنا شریعت اسلامی کا مقصد ہے۔

۲۔ اسلام کا اصلی مقصد کبھی بھی جنگ نہیں تھا صرف راہ صلح، تعاون اور موعظہ کے مسدود ہو جانے کے بعد جنگ ایک استثنائی علاج اور راہ حل ہے۔

۳۔ چونکہ جنگ ایک استثنائی اور اضطراری، قانون ہے اس سے صرف ضرورت کے موقع پر استفادہ کیا جاتا ہے لہذا صحیح عاقلانہ انداز کے مطابق تعصب، انتقامی جذبہ نیز ظلم و تعدی و انحراف سے منزا ہو کر اس قانون پر عمل کرنا چاہئے۔ اس کی خلاف ورزی قطعاً ممنوع و مذموم ہے۔

۴۔ جہاد اور اسلام کے جنگی قوانین میں یہ بتایا گیا ہے کہ غیر فوجی اور وہ افراد جو فوجی علاقہ سے الگ اپنے روزمرہ کے کاموں میں مشغول ہوں اور آمادۂ جنگ نہ ہوں ان سے تعرض نہ کیا جائے۔

۵۔ جب دشمن صلح کی پیشکش کرے تو لشکر اسلام کو جنگ موقوف کر کے ان کی یہ پیشکش قبول کر لینی چاہئے۔

۶۔ جنگی اسیروں کے ساتھ لطف و محبت سے پیش آنا چاہئے۔ ان کے ساتھ نیک سلوک کیا جانا چاہئے۔ ان کی آزادی کے سلسلہ میں یہ کہا گیا ہے کہ کچھ لوگوں پر صرف

احسان رکھ کر چھوڑ دینا چاہئے اور کچھ لوگوں کو فدیہ (معاوضہ) لے کر رہا کرنا چاہئے ۱۲؎
جنگی اسیروں کے ساتھ حسن سلوک کی اسلام میں بہت سخت تاکید ہے قرآن مجید نے ابرار اور مقربین کی صفت اسیروں کو کھانا کھلانا قرار دیا ہے ۱۳؎

۷۔ بچوں، عورتوں، ازکار افتادہ بوڑھے مردوں اور اندھوں کو قتل کرنا منع ہے۔ اسی طرح درختوں اور باغات کو نقصان پہنچانا، دشمن لشکر پر پانی بند کرنا، دشمن کے درمیان زہر پھیلانا بھی بہت بڑا جرم ہے۔ اسلام نے ان باتوں پر پابندی لگائی ہے۔

۸۔ اسلامی لشکر، دشمن کو اطلاع دیئے بغیر میدان کارزار میں نہ جائے یہاں تک کہ ان تک خبر پہونچنے تک جنگ روکے رہیں۔

۹؎ جہاد اسلامی میں جنگ بندی کا اعلان صرف دشمن کے ہتھیار ڈال دینے پر مبنی نہیں ہے بلکہ اگر مسلمانوں سے ان کا شر دور ہو جائے اور وہ عہد کرلیں کہ طغیان، فتنہ، مقدسات اور اسلامی معاشرہ کے حقوق پر تجاوز سے ہاتھ اٹھالیں گے تو یہ بھی جنگ بندی کے لئے کافی ہے ۱۴؎

اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ اگر میدان جنگ میں جنگ بند کرنے یا صلح کرنے کی تھوڑی سی وجہ آجاتی تھی تو مسلمان اس سے استفادہ کرتے تھے۔ اور اگر قانون اسلام کے مطابق ایک سپاہی بھی دشمن کو امان دیدیتا یا اس سے معاہدہ کرلیتا تھا تو اس معاہدہ اور امان کو توڑنا بڑے سے بڑے عہدے دار کے لئے جائز نہ تھا۔ ۱۵؎

پیغمبر اسلامؐ نے اہل کتاب کے ساتھ پہلا معاہدہ کیا یہ معاہدہ قیام حکومت اسلامی کا سنگ بنیاد تھا۔ صلح و تفاہم کی بنیاد پر عقائد اور عبادات میں مذہبی آزادی کے لئے پہلا سیاسی رابطہ تھا جو پیغمبر نے قائم کیا۔

چھٹی ہجری میں آنحضرتؐ نے معیّن مدت کے لئے جنگ بندی اور خونریزی سے بچنے کے لئے حدیبیہ نامی صلح کی۔ اس معاہدہ کی بنیاد پر مکہ میں داخل ہوئے بغیر، عمرہ کئے بغیر، رسول مقبول مدینہ واپس آگئے۔ آپ نے دائمی صلح کے لئے اہل نجران

سے معاہدہ کیا۔ آپ نے پہلے انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا اور اسلامی حکومت کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے رئیس حکومت کے جوار لطف وکرم میں اپنی روزمرہ کی زندگی بسر کرنے کا وعدہ کرلیا۔

روایات کا مطالعہ

پیغمبر اکرمؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا: جب تک کسی کو اسلام کی دعوت نہ دے دو اسوقت تک اس سے جنگ نہ کرو خدا کی قسم اگر پروردگار تمہارے ذریعہ کسی انسان کی ہدایت کرتا ہے تو وہ تمہارے لئے ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جن پر آفتاب چمکتا ہے۔[۱۶]

حضرت علیؑ نے فرمایا: پیغمبرؐ نے مجھے حکم دیا کہ جنگ شروع کرنے سے پہلے جو نعرہ اپنے لئے معین کرو اس میں تمہارے پروردگار کا نام ہونا چاہئے۔[۱۷]

ان روایتوں میں جہاد اسلامی کا مقصد مکمل طور سے واضح ہے۔ کشور کشائی یا وسعت طلبی ان جہادوں کا مقصد نہیں بلکہ آئین حق کی دعوت، ظلم وستم کی روک تھام اور فتنہ کی آگ کو بجھانے کے لئے فرمان خدا کا اجراء مقصود اصلی ہے انسانی مقصد، کو غفلت سے بچانے کے لئے مسلمان مجاہدین اپنے مبارزاتی نعروں میں بھی خدا کا نام شامل کرتے ہیں صرف ان ہی لوگوں سے نبرد آزمائی کرتے ہیں جو فتنہ پرور ہیں اور تعلیم الٰہی کے سایہ میں راہ سعادت حاصل کرنے والوں کے لئے کانٹا بن جاتے ہیں.

پیغمبر اکرمؐ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

مشرکین سے جنگ کرو لیکن بوڑھوں اور ان کے بچوں کو گزند نہ پہونچاؤ۔[۱۸]

آپ نے اپنی وصیت میں اپنے پیرو کاروں سے فرمایا:

مشرکین کی عورتوں اور بچوں کو جنگ میں نہ کھینچو ایک شخص نے کہا کیا وہ مشرکین کی اولاد نہیں ہیں؟

حضرت نے جواب دیا کہ کیا تمہارے اچھے لوگ مشرکین کی اولاد نہیں ہیں!![۱۹]

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ جب پیغمبر اکرمؐ لشکر روانہ فرماتے تو انہیں اپنے پاس بلا کر اس طرح نصیحت فرماتے۔

''خدا کے نام اور اس کی مدد سے اس کے راستہ پر پیغمبر کی روش کے مطابق چل پڑو۔ دشمنوں کے ساتھ خیانت نہ کرو۔ انہیں مثلہ نہ کرو، مکر و حیلہ سے ان تک نہ پہونچو، ناتوان مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کرو درختوں کو مت کاٹو (مگر مجبوری کی حالت میں) مسلمانوں کے بچوں یا بزرگوں میں سے اگر کوئی کسی مشرک کو پناہ دینے میں دلچسپی رکھتا ہو اور پناہ دے بھی دے تو وہ پناہ میں ہے یہاں تک کہ حکم خدا سے، اگر اس نے تمہاری پیروی کی تو وہ تمہارا دینی بھائی شمار کیا جائے گا۔ اور اگر اس نے انکار کیا تو تم اسے صحیح و سالم اس کے گھر اور کاشانہ تک پہونچادو اور خدائے بزرگ سے مدد طلب کرو۔[20]

میدان جنگ میں اسلام کے رخ کو پیش کرنے اور اس مقدس آئین کی بے انتہا محبت اور لطف و کرم سمجھنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ بشریت کے لئے ''صلح و زندگی'' کا تحفہ لانے والے اسلام کو ناسمجھی میں ''دین شمشیر''[21] کہنے والے لوگوں کا اس میں جواب مضمر ہے جو قرآن و سنت کے برخلاف جہاد اسلامی کی غلط تفسیر پیش کرتے ہیں۔

حواشی:

۱۔ سورہ نساء/۹۴

۲۔ سورہ بقرہ/۲۰۸

۳۔ سورۂ انبیاء/۱۰۷

۴۔ سورۂ حجرات/۹

۵۔ سورۂ نور/۲۲

۶۔ سورۂ مائدہ/۱۳

۷۔ سورۂ زخرف/۸۹

۸۔ سورۂ انفال/۶۱

۹۔ سورۂ نساء/۹۰

۱۰۔ سورۂ ممتحنہ/۸

۱۱۔سورۂ مائدہ/۲

۱۲۔سورۂ محمد/۴

۱۳۔سورۂ دھر/۸

۱۴۔شرائع محقق ''کتاب الجهاد''۔الاسلام عقیدۃ وشریعۃ تالیف شیخ محمود شلتوت ص ۴۷۳

۱۵۔مذہبی اقلیتوں کے حقوق کی بحث میں اس کی تشریح ہو چکی

۱۶۔وسائل الشیعہ ،جلد۲ص ۴۲۱

۱۷۔مستدرک الوسائل جلد۲ص ۲۶۵

۱۸۔وسائل الشیعہ ،جلد۲ص ۴۲۵

۱۹۔الاسلام عقیدۃ وشریعۃ ص ۴۷۴۔یہ روایت اہل سنت کے طریق سے وارد ہوئی ہے

۲۰۔وسائل الشیعہ جلد۲ص ۴۲۴

۲۱۔گوستاولیبون اپنی کتاب ''تمدن اسلام وعرب''میں تحریر فرماتے ہیں عقائد اسلامی کی وسعت ،سادگی ،وضاحت اور اس کے علاوہ خلائق کے ساتھ عدل واحسان نے لوگوں کے دلوں پر اس مذہب کا سکہ بیٹھا دیا اور اسی وجہ سے اس مذہب نے پوری دنیا کو مسخر کرلیا۔قسطنطنیہ کے بادشاہوں کے زمانہ سے دین مسیح کی پیروکار مصری اقوام نے بھی اس کی وضاحت اور حسن رفتار کی بناپر صرف دین محمدی کی دعوت پر دین مسیح کو چھوڑ کر اسلام قبول کرلیا۔حالانکہ غالب یا مغلوب کسی بھی مسلمان قوم نے محض دین مسیح سے متاثر ہو کر اسلام ترک نہیں کیا۔جب ہم مسلمین اول کے فتوحات کا بغور مطالعہ کرتے ہیں اور اسکی کامیابی کے علل و اسباب پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں یہ ملتا کہ مذہب کی اشاعت میں تلوار سے کام نہیں لیا گیا ہے ۔کیوں کہ انہوں نے مغلوب اقوام کو ہمیشہ آزادی عطا کی ۔اگر عیسائیوں نے اپنے فاتح اعراب کا مذہب حتی کہ ان کی زبان قبول کی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنے حکام کے مقابل میں نئے حکام کو زیادہ عادل پایا اس کے علاوہ فاتح کا مذہب بھی ان کے مذہب کی بہ نسبت زیادہ آسان اور حقیقت سے قریب تھا۔۔۔۔(ص ۱۴۸۔ص ۱۴۴)

اسلام میں جیل کا تصور

گذشتہ شمارہ میں تعزیرات کے سلسلہ میں بیان کیا جاچکا ہے کہ تعزیرات کی ایک قسم ''جیل'' بھی ہے۔ جیل بھی مجرم کو جرم سے روکنے میں موثر کردار ادا کرسکتی ہے۔ بعض اوقات ملزمین کی راہ فرار مسدود کرنے اور مقروضوں کو قرض کی ادائیگی پر مجبور کرنے کے لئے جیل کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہوتا۔ اسی لئے اسلامی فقہ میں جیل سے متعلق احکام وقوانین کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔

لہٰذ اسلامی حکومت سے متعلق گفتگو کو مکمل کرنے کی غرض سے اس شمارہ میں بطور اشارہ کچھ باتیں پیش کی جارہی ہیں۔ تفصیلی گفتگو کے لئے کئی جلدوں پر مشتمل کتاب درکار ہے۔ بعض محققوں نے اس موضوع پر متعدد کتابیں تحریر فرمائی ہیں۔(۱)

ا۔جیل کی تاریخ

تاریخ بشریت میں پہلی جیل کس نے اور کب بنائی؟ اس کا صحیح جواب ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی انسان کی سماجی زندگی کی تاریخ۔ بظاہر حکومت اور جیل کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ حکومت کے ساتھ جیل کا بھی جنم ہوا ہے۔ بلکہ حکمرانوں کے علاوہ ظالم جاگیرداروں وغیرہ نے بھی اپنی رعایا کو سزا دینے کے لئے قید خانے تعمیر کرائے تھے۔ وہ کبھی کبھی اپنے قیدیوں کو جانوروں کے طویلے میں بھی قید کردیا کرتے تھے۔

(۱) اس سلسلہ کی ایک کتاب ''احکام السجون'' ہے جسے ڈاکٹر شیخ احمد وائلی نے تحریر فرمایا ہے۔

اسلام میں جیل کب وجود میں آئی ؟ اس سلسلہ میں تقریباً تمام مورخوں کا اجماع ہے کہ آنحضرتؐ کے دور حکومت میں باقاعدہ طور پر کسی قید خانہ کا وجود نہیں تھا۔ البتہ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ آنحضرتؐ جیل کے وجود کو ناجائز سمجھتے تھے بلکہ اس کی وجہ زیادہ تر یہ تھی کہ اس وقت اسلامی سماج میں اتنی وسعت نہیں آئی تھی اور اس وقت کے لوگوں میں اسلامی قوانین کے تئیں وفاداری و فرض شناسی کا جذبہ کہیں زیادہ تھا جس کے باعث جرائم کی شرح بہت کم تھی۔

اسی لئے قرآن مجید میں بھی کوئی ایسا جملہ نہیں ہے جس سے اس زمانہ میں جیل کی موجودگی کا پتہ چل سکے۔ لیکن اس کے باوجود ملزموں کے الزامات کی چھان بین اور قطعی فیصلہ تک انھیں روکے رکھنے یا مالی توانائی ہونے کے باوجود قرض ادا نہ کرنے والے قرضداروں یا اسلامی جنگوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہونے والوں کے لئے دوسرے طریقے اپنائے جاتے تھے۔

۱) کبھی مجرموں کو مسجد کے ایک گوشہ میں قید کر دیتے تھے اور چونکہ انھیں زنجیروں میں جکڑا نہیں جاتا تھا اس لئے وہاں ایک محافظ رکھ دیا جاتا تھا تاکہ وہ بھاگ نہ سکیں۔ یا ان کے اردگرد ایک لکیر کھینچ دی جاتی تھی اور ان سے کہہ دیا جاتا تھا کہ اگر وہ اس لکیر سے باہر قدم رکھیں گے تو انجام کے وہ خود ذمہ دار ہوں گے۔ ملزمین بھی مخصوص سماجی وجوہات سے یا جرم میں سنگینی کے ڈر سے اس لکیر سے باہر نہیں جاتے تھے۔ بعض روایتوں میں لفظ "ترسیم" سے شاید یہی لکیر مراد ہو۔

۲) گھر کے دالان میں قید کر دیتے تھے کیونکہ بہت سے گھروں میں دروازہ اور صحن کے درمیان میں دالان ہوا کرتا تھا اور بہت سے دالانوں میں صحن کی طرف بھی دروازہ ہوا کرتا تھا کہ اگر دونوں طرف کا دروازہ بند کر دیا جاتا تو دالان جیل کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔

۳) گھر بھی ایک طرح کے قید خانے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید کا حکم ہے کہ "بدکار عورتوں کو گھر میں قید کر دو یہاں تک کہ انہیں موت آجائے" ۱؎ البتہ یہ حکم زنا کاروں پر حد جاری کرنے کا حکم نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔ حد کا حکم آنے کے بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

۴) "ہمراہی" جیل کی ایک دوسری شکل تھی۔ قرض خواہ اپنے صاحب استطاعت قرض دار

۱؎ نساء: ۱۵

کو اپنے ساتھ ساتھ ہر جگہ لے جاتا تھا اور جب تک وہ اس کا قرض ادا نہیں کر دیتا تھا اپنے سے جدا نہیں کرتا تھا۔

۵۔ اسیروں کو غلام بنا لینے کا مسئلہ بھی جیل کا بدل تھا جس کے احکام، اسلامی فقہ میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

البتہ یہ سب، جیل کی نہایت سادہ اور ابتدائی شکلیں تھیں جو زمانہ کے گذرتے، اسلامی سماج میں توسیع، زندگی کی پیچیدگیوں اور مجرموں کی تعداد میں اضافہ کے ساتھ ساتھ اس کی شکل بھی بدل گئی اور جیل نے ایک مخصوص عمارت کی شکل اختیار کر لی۔ اگر چہ دوسرے ملکوں میں صدیوں قبل سے جیل، ایک مستقل عمارت کی شکل میں موجود تھی۔

پہلی جیل، عصر عمر میں

اگر چہ بعض مورخوں کا اصرار ہے کہ شروع کے تین خلفاء کے زمانہ میں، مجرموں کو بند رکھنے کے لئے مخصوص عمارت کی شکل میں کوئی قیدخانہ موجود نہیں تھا اور صرف امیر المومنین کے زمانہ میں قیدیوں کے لئے مخصوص عمارت، قیدخانہ کے نام سے تعمیر کرائی گئی لیکن یہ دعویٰ ان بہت سی روایتوں کے خلاف ہے جو یہ کہتی ہیں کہ سب سے پہلے عمر ہی نے قیدخانہ کی عمارت بنوائی ہے۔

اس کی دلیل، ''ابن حمان'' نے حنفی فقہ کی کتاب ''شرح فتح القدیر'' میں بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

پیغمبر اسلامؐ اور ابو بکر کے زمانہ میں جیل کا وجود نہیں تھا مجرموں کو مسجد میں یا گھر کے دالان میں قید کیا جاتا تھا، یہاں تک کہ عمر کے زمانہ میں مکہ میں ایک گھر چار ہزار درہم میں خرید کر اسے جیل بنا دیا گیا۔[1]

مکہ میں عمر کے گھر خریدنے کا تذکرہ دوسری کتابوں میں بھی ہے۔ جیسے کتاب ''النظم الاسلامیۃ'' اور کتاب ''الجنایات المتحدہ بین القانون والشریعۃ''۔

ان لوگوں نے یہ بھی صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ عمر نے یہ گھر مکہ میں ایک سردار ''صفوان بن

۱۔ شرح فتح القدیر، جلد ۵، ص ۴۷۱

لنہ" سے خریدا تھا۔ ابو اسحاق شیرازی نے بھی شافعی فقہ کی کتاب "مہذب" میں لکھا ہے کہ عمر نے اس گھر کو جیل میں تبدیل کر دیا تھا۔[1]

خلیفہ دوم کے زمانہ میں کچھ لوگ اپنے اشعار میں کچھ ایسے مسائل کو پیش کرتے تھے جو عمر کو پسند نہیں تھے یا خلاف شرع تھے۔ عمر نے انھیں قید خانہ میں بند کرنے کا حکم دے دیا۔ ان شاعروں نے قید خانہ سے اشعار کی شکل میں تو بہ نامہ عمر کے پاس بھیجا۔ اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ عمر کے زمانہ میں قید خانہ موجود تھا۔

جن شاعروں کو عمر نے قید کیا تھا ان ہی میں سے ایک "حطیہ" نامی شاعر بھی تھا۔ اس نے قید خانہ میں سے یہ دو شعر عمر کے پاس بھیجے:

ماذا تقول لا راخ بذی مرخ — حمر الحواصل لا ماء ولا شجر

القیت کاسبهم فی قعر مظلمة — فارحم علیک سلام الله یا عمر

اس شاعر نے ان اشعار میں اپنے بچوں کا حال زار اس طرح بیان کیا ہے:

لال سینہ والے چوزوں کے جواب میں آپ کیا کہیں گے جو "ذی مرخ" کے علاقہ میں بے آب و دانہ پڑے ہوئے ہیں۔ آپ نے ان کی روزی روٹی لانے والے کو تاریک کھائی میں قید کر رکھا ہے۔ ان پر رحم کیجئے۔ اے عمر آپ پر خدا کا سلام ہو۔

خاص طور سے "قعر مظلمۃ" کی تعبیر سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس قید خانہ میں کوئی تاریک گڑھا بھی موجود تھا۔ آج کی زبان میں موت کا کنواں۔

کچھ دوسرے قرائن سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں اس قسم کا قید خانہ موجود تھا۔ کیوں کہ اسلامی ممالک کی عظیم توسیع اور قدرتی طور پر جرائم کی شرح میں اضافہ کی صورت میں یہ یقین نہیں کیا جاسکتا کہ اس زمانہ میں مجرموں کی نگہداشت کے لئے کوئی قید خانہ تھا ہی نہیں۔

جیل امیر المومنین کے زمانہ میں

جو لوگ عمر کے زمانہ میں جیل کے وجود کے منکر ہیں اور جو لوگ جیل کے وجود کے دعویدار

[1] المہذب جلد ۲ ص ۲۹۳

تیں ان کے اقوال کا ٹکراؤ اس طرح سے دور کیا جا سکتا ہے کہ عمر نے اپنے زمانہ میں جیل کے لئے کوئی نئی عمارت تعمیر نہیں کرائی تھی بلکہ "صفوان بن امیہ" کا گھر خرید کر اسے جیل میں تبدیل کر دیا تھا۔ لیکن حضرت امیر المومنین علی نے جیل کے لئے ایک مستقل عمارت تعمیر کروائی تا کہ قیدیوں کے انسانی مسائل زیادہ بہتر طریقہ سے حل کیے جا سکیں اور ان کے فرار کی راہیں بھی مسدود کر دی جائیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ حضرت نے پہلی جیل چٹائی سے بنائی تھی جس سے ہوا بھی آتی تھی اور روشنی بھی۔ آپ نے اس کا نام "نافع" رکھا تھا (شاید اس غرض سے کہ یہ جیل، اخلاقی لحاظ سے مجرموں کی روح پر اثر کرے اور ان کی جلدی اصلاح ہو جائے) لیکن افسوس ہے کہ اس جیل کی صورت حال سے قیدیوں نے ناجائز فائدہ اٹھایا اور چور اس کی دیواروں میں سوراخ کر کے فرار ہو گئے۔ امام نے مجبوراً مٹی سے ایک مضبوط و مستحکم جیل بنوائی جس کا نام "مخیس" رکھا۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں، خلیفۂ دوم کے زمانہ میں اسلامی ممالک میں اتنی زیادہ توسیع ہو گئی تھی کہ مجرموں کے لئے کسی مستقل جیل کے بغیر اس وقت کے اسلامی سماج کا نظم و نسق چلانا ممکن نہیں تھا۔ جیل کا وجود نہ ہونے پر اتنے اصرار کا سبب بظاہر سیاسی مسائل اور قومی تعصب نظر آتا ہے ورنہ اس کے وجود پر تاریخ بھی گواہ ہے اور اس وقت کے حالات کے قرائن بھی شہادت دیتے ہیں۔

بہر صورت، اس زمانہ میں جیل کا استعمال مجرموں اور صاحب استطاعت قرضداروں کی نگرانی کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ سیاسی مخالفوں کی آواز دبانے کے لئے اس کا استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ جب کبھی ان کا وجود نا قابل برداشت ہو جاتا تھا تو انھیں جلا وطن و شہر بدر کر دیا جاتا تھا۔ حضرت ابوذر کی داستان، بہترین گواہ ہے جب عثمان اور ان کے حالی موالی، ابوذر کی زبان حق ترجمان بند کرنے میں ناکام ہو گئے جو ہمیشہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں مشغول رہا کرتی تھی اور امویوں کے لئے ان کا وجود نا قابل برداشت ہو گیا تو انھیں جلا وطن کر کے ربذہ بھیج دیا گیا جہاں کی آب و ہوا انتہائی خراب و نا قابل برداشت تھی۔ حضرت ابوذر نے اسی صحرا میں عالم غربت و تنہائی میں

دم توڑ دیا۔ اور رحمت الٰہی کے سایہ میں چلے گئے۔

لیکن بنی امیہ کے زمانہ میں جیل کی شکل مکمل طور سے بدل گئی اور اسے سیاسی مخالفوں، اموی سیاست کے ناقدوں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر بجالانے والوں کو قید کرنے کا مرکز بنادیا گیا۔

۲) جیل کی قسمیں اور اس کا فلسفہ

آزادی سے انسان کے عشق کا سرچشمہ، کمال و ترقی سے اس کا عشق ہے کیونکہ قید و بند میں رہ کر کوئی موجود ترقی و کمال کی منزلیں طے نہیں کرسکتا۔ جانوروں کو بھی قفس پسند نہیں ہے چاہے اس میں ضرورت کی تمام چیزیں فراہم کردی جائیں۔ وہ آزادی کو اسیری پر ترجیح دیتے ہیں چاہے قفس سے باہر ان کے لئے ہزاروں قسم کے خطرات موجود ہوں۔

اس لئے قفس میں اسیر جانوروں کی امنگیں مرجاتی ہیں ان کا جوش و ولولہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ ہاں اگر ان کی پیدائش ہی قفس میں ہوئی ہو اور انھوں نے آزادی کا مزہ چکھا ہی نہ ہو تو صورت حال میں فرق آسکتا ہے۔

اگر جانوروں میں یہ احساس آزادی، صرف جبلی و فطری طور پر پایا جاتا ہے تو انسان میں اس عاطفی اور اک کو عقلی ادراک کا سہارا بھی مل گیا ہے۔ انسان فطری تقاضہ کے ساتھ ساتھ دلیل و برھان کے ذریعہ آزادی مانگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے لئے ایک سب سے بڑی سزا اس کی آزادی کو چھین لینا اور اس کو قید کردینا ہے۔

یہ سچ ہے کہ تاریخ انسانیت کے زیادہ تر جیلوں کی بنیاد ظلم و ستم پر استوار تھی۔ مطلق العنان ڈکٹیٹر، کینہ پرور اور انتقام جو افراد کے ہاتھوں میں اپنے ناجائز مقصد کی تکمیل کا ایک حربہ تھی۔ لیکن یہ تکلیف دہ صورت حال، جیل کے واقعی فلسفہ پر پردہ نہیں ڈال سکتی۔ مجرموں کی اصلاح اور سماجی برائیوں کو مٹانے کی تحریک میں اس کے مثبت و مفید اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

آزادی سے محرومی، مندرجہ ذیل دس مقاصد کے حصول کے لئے قیدیوں پر ایک بھاری دباؤ ہے۔

۱) ایذا رساں جیل

اس قسم کی جیل عام طور سے ان مجرموں کے لئے ہے جو کسی جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ان کی آزادی چھین کر انہیں ان کے جرم کی برائی سے آشنا کیا جاتا ہے تاکہ مستقبل میں وہ ایسی حرکت دوبارہ نہ کریں اور دوسرے لوگ بھی عبرت حاصل کریں۔ جیل کی یہ قسم ابتدا سے آج تک موجود ہے۔ اور چند استثنائی مواقع کے سوا ہر حکومت میں اس قسم کی جیل موجود رہی ہے۔

۲) اصلاحی جیل

اس قسم کی جیل ان لوگوں کے لئے ہے جو کسی بری عادت میں پھنس گئے ہیں (جیسے منشیات کے عادی افراد) تعلیم و تربیت اور نصیحتیں ان پر کارگر نہیں ہوتیں۔ انھیں ایک مدت کے لئے سماج سے جدا کر کے جیل میں ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ تاکہ وہاں ان کی عادت چھڑا کر ان کی اصلاح کی جا سکے۔

۳) احتیاطی جیل

کہیں پر کوئی اہم حادثہ ہو جاتا ہے۔ کسی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ قاتل کا صحیح طریقہ سے پتہ نہیں چلتا لیکن کچھ لوگ شک کے دائرہ میں ہوتے ہیں۔ قاتل کے بارے میں تحقیق ضرور ہونی چاہئے۔ لیکن ممکن ہے تحقیق کے دوران اصل قاتل بھاگ جائے۔ جرم ثابت ہونے کے بعد وہ ہاتھ نہ آ سکے۔ ایسے مواقع پر ملزم یا ملزموں کو وقتی طور پر قید کر لیا جاتا ہے۔ اگر تحقیق کے بعد ان کی بے گناہی ثابت ہو جاتی ہے تو ان سے معافی مانگ کر انھیں آزاد کر دیا جاتا ہے۔ اور اگر جرم ثابت ہو جاتا ہے تو انھیں ان کے جرم کی سزا دی جاتی ہے۔

اس طرح کی جیل بھی عام طور سے ہر جگہ اور ہمیشہ رہی ہے۔ البتہ گرفتار کیا گیا ملزم ممکن ہے واقعی بے گناہ ہو۔ لہٰذ تحقیقات کے عمل میں تیزی لانا اور جلد اسے پایہ تکمیل تک پہچانا ضروری ہے۔ تاکہ بے گناہ ملزم کم سے کم وقت جیل میں گزارے۔

۴) تنبیہی جیل

اس قسم کی جیل عام طور سے ان سرکش بچوں کے لئے ہے جن پر کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا لیکن اگر مطلق آزادی دے دی جائے تو وہ اس آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے جرم کے راستہ پر چل پڑیں گے۔ اس لئے ان کے بعض جرائم کے پیش نظر انھیں جیل میں ڈال دیا جاتا ہے تاکہ وہاں ان کی اچھی تربیت کی جا سکے۔

۵) سیاسی جیل

سیاسی قیدی عام طور سے ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جن کی سیاسی سرگرمیاں سماج، اور اس پر حاکم سسٹم کی مصلحتوں کے خلاف ہوتی ہیں۔ بعض اوقات ان کی سرگرمیاں نہ صرف یہ کہ سماج کے مفادات کے خلاف نہیں ہوتیں بلکہ اس کے حق میں ہوتی ہیں، لیکن اس سماج پر مسلط مطلق العنان نظام حکومت کے مفادات کے خلاف ہوتی ہیں۔ آج زیادہ تر ممالک کی جیل میں قید سیاسی قیدیوں کی یہی صورت حال ہے کہ انھیں راہ حق پہ چلنے کے جرم میں قید کر دیا گیا ہے۔

۶) استحقاقی جیل

یہاں استحقاق سے مراد، کسی سے اپنا حق وصول کرنا ہے۔ کسی نے کسی سے قرض لیا ہے۔ قرض دار کے پاس قرضہ ادا کرنے کا پیسہ موجود ہے اس کے باوجود وہ قرض ادا کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ ایسی صورت حال میں کبھی کبھی قرض دار کو جیل میں ڈال دیا جاتا ہے تاکہ اس پر دباؤ پڑے اور وہ قرض ادا کرنے پر تیار ہو جائے۔ جیسے ہی وہ قرض ادا کرنے پر تیار ہو جائے اسے فوراً آزاد کر دینا چاہیے کیونکہ اسے قید کرنے کا مقصد ختم ہو چکا ہے۔

۷) حفاظتی جیل

ایسی صورت حال بہت کم پیش آتی ہے۔ یہ جیل ان لوگوں کے لئے ہے جن سے لوگ اتنے خفا ہو جاتے ہیں کہ اگر ان کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو ان کی جان خطرہ میں پڑ سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان سے کوئی جرم بھی سرزد ہوا ہو مگر اس کی سزا موت نہیں ہے۔ ایسے موقع پر حکومت جو عوام کے

مفادات کی محافظ ہے، عوام کا غصہ ٹھنڈا ہونے تک ایسے افراد کو جیل کی چہار دیواری کے پیچھے بھیج دیتی ہے۔ حالات نارمل ہونے اور ان کی جان کا خطرہ ٹل جانے کے بعد انھیں آزاد کر دیتی ہے۔ اس طرح کے حالات عام طور سے اس وقت پیش آتے ہیں جب کسی ملک میں انقلاب آتا ہے۔ سماجی طوفان بپا ہوتا ہے اور عوامی جذبات بھڑکے ہوئے ہوتے ہیں۔

مذکورہ سات قسموں کی جیل کا مقصد اور فلسفہ معقول ہے لیکن مقابلہ میں کچھ نامعقول و ظالمانہ مقاصد کی جیلیں بھی پائی جاتی ہیں جن کی مثالیں ماضی و حال میں موجود ہیں۔ ہم یہاں اس قسم کی جیلوں کا تذکرہ کر رہے ہیں:

۱) انتقامی جیل

یہ ایک ایسی جیل ہے جس کا کوئی معقول مقصد نہیں ہے۔ ظالم و ستمگر حکمراں، بڑے جاگیردار اپنی رعایا اور حریت پسند عوام سے انتقام لینے اور اپنے کینہ و نفرت کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لئے انھیں ناحق جیلوں میں ڈال دیتے ہیں۔ اور کبھی کبھی یہ قید اتنی طولانی ہوتی ہے کہ وہ وہیں پر تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیتے ہیں۔

۲) مزاحمت شکن جیل

راہ حق کے مجاہدوں کی تحریک مزاحمت کو کچلنے اور مجاہدوں کا حوصلہ پست کرنے کے لئے ظالم و ستمگر حکمراں انھیں قید کر دیتے ہیں اور جیل میں انھیں جسمانی و روحانی تشدد و ایذا رسانی کا نشانہ بناتے ہیں جن مجاہدوں میں قوت ارادی مضبوط ہوتی ہے۔ مصائب و آلام جھیلنے کی طاقت زیادہ ہوتی ہے وہ اس امتحانی منزل سے سرخرو آگے بڑھ جاتے ہیں بلکہ بھٹی میں پکائے گئے فولاد کی طرح ان کے ارادہ اور بھی مضبوط ہو جاتے ہیں ان میں مقابلہ کی قوت اور بھی بڑھ جاتی ہے لیکن کمزور ارادہ والوں میں اس قسم کی جیل، منفی اثر چھوڑتی ہے۔ اس لئے وہ قید سے رہائی کے بعد اپنا راستہ بدل دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات وہ ان ہی ظالم حکمرانوں کے آلۂ کار بن جاتے ہیں کیونکہ جیل میں یہ حکومتیں ان پر کام کرتی ہیں۔

۳) رابطہ توڑنے والی جیل

یہ جیل، سیاسی و مذہبی لیڈروں سے مخصوص ہے۔ جب ظالم حکمراں، ان لیڈروں کی جہادی تحریک سے عاجز آجاتے ہیں تو عوام سے ان عظیم لیڈروں کا رابطہ توڑنے کے لئے انھیں قید کردیتے ہیں لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس قسم کی جیل، عام طور سے الٹا نتیجہ دیتی ہے۔ ان لیڈروں کے پیروں کو مزید متحد کردیتی ہے اور ان کے درمیان لیڈروں کی محبوبیت و مقبولیت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

۴) رکاوٹ ہٹانے والی جیل

کبھی کبھی کوئی عالم، موجد، مفکر اور لائق انسان کسی ڈکٹیٹر کے ناپاک عزائم میں رکاوٹ بن جاتا ہے تو اسے قید میں ڈال دیا جاتا ہے تاکہ ڈکٹیٹر کسی رکاوٹ کے بغیر، چین و سکون کے ساتھ اپنے ظلم و ستم کا دامن وسیع کرتا رہے۔

تاریخ میں ایسے نمونہ بھی نظر آتے ہیں کہ ظالم حکمرانوں نے خوبصورت عورتوں پر قبضہ جمانے کے لئے ان کے شوہروں کو جیل کی کال کوٹھریوں میں قید کردیا۔

۵) پاکدامنی کے باعث جیل

جیلوں کی تاریخ میں سب سے عجیب جیل وہ ہے جہاں پاکدامن افراد کو بے گناھی کے جرم میں قید کیا جاتا ہے۔ یہ بات ماننا ہی پڑے گی کہ گناہ و بدکاری میں غرق سماج میں پاکدامنی و بے گناہی کوئی معمولی جرم و گناہ نہیں ہے!! ایسے سماج میں پاکدامن رہنا بڑا عیب مانا جاتا ہے۔ کیونکہ پاکدامنی، گناہگاروں کے منصوبوں پر پانی پھیر دیتی ہے۔ تاریخ میں کتنے ہی یوسف ظالموں کی جیل میں قید نظر آتے ہیں کیوں کہ وہ اپنا دامن گناہوں سے آلودہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

مذکورہ پانچ قسم کی جیلوں کا کوئی عقلی و شرعی جواز نہیں ہے لہٰذ یہ ہماری گفتگو کے دائرہ سے باہر ہیں۔ صرف ضروری وضاحت کے خاطر ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

جیل قرآن کی روشنی میں

جیل کے جو مقاصد بیان کئے گئے ہیں ان میں سے بہت سے مقاصد یقیناً معقول اور قابل فہم ہیں اور ان مقاصد کے پیش نظر، جیل ایک سماجی ضرورت ہے۔ چاہے اس کا مقصد مجرموں کو

سزا دینا ہو یا ان کی اصلاح، خطرہ کو دور کرنا ہو یا مادّۂ فساد کی بیخ کنی ۔ قرآن مجید میں بھی اس مفہوم کی طرف اشارے کئے گئے ہیں ۔ قرآن وحدیث اور عربی لغت میں جیل کا مفہوم بیان کرنے والے الفاظ بہت ہیں ۔ بعض الفاظ ، صریحاً اس مفہوم پر دلالت کرتے ہیں اور بعض الفاظ قابل بحث و گفتگو ہیں۔

ان ہی الفاظ میں سے ایک لفظ ''سجن'' ہے جو سورہ یوسف میں خدا کے جلیل القدر و پاک دامن نبی کے قید ہونے کے سلسلہ میں نو مرتبہ استعمال ہوا ہے، اور ایک مرتبہ سورۂ شعراء میں فرعون کی داستان میں استعمال ہوا ہے جب وہ حضرت موسیٰ سے خطاب کر کے انہیں جیل بھیجنے کی دھمکی دیتے ہوئے کہتا ہے:

لئن اتخذت الها غیری لأ جعلنک من المسجونین (شعراء/ ۲۹)

اگر تم میرے سوا کسی اور کو معبود بناؤ گے تو میں تمھیں قیدیوں میں شامل کر دوں گا ۔ اس سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ و فرعون اور اس سے پہلے حضرت یوسف و عزیز مصر کے زمانہ میں جیل اپنی مکمل شکل میں موجود تھی جس میں گنہگار و بے گناہ کو قید کیا جاتا تھا اور کبھی کبھی وہ اتنی طویل مدّت تک اس میں پڑے رہتے تھے کہ لوگ انہیں بھول جاتے تھے۔

جیل کے لئے دوسرا لفظ ''حبس'' ہے جو قرآن مجید میں صرف دو مقامات پر استعمال ہوا ہے لیکن جیل کے معنی میں نہیں ۔ البتہ حدیثوں میں یہ لفظ جیل کے معنی میں وسیع پیمانہ پر استعمال ہوا ہے (۱)

لفظ ''امساک'' بھی جیل کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔ قرآن مجید میں یہ لفظ اس معنی میں صرف ایک جگہ پر سورۃ نساء کی پندرہویں آیت میں زناکار عورتوں کے سلسلہ میں استعمال ہوا ہے۔

لفظ ''نفی'' از زمین (زمین سے باہر کرنا) بھی سورۃ مائدہ کی ۳۳ ویں آیت میں استعمال ہوا ہے تفسیروں میں اس سے جیل مراد لی گئی ہے۔

لفظ ''ارجاء'' سورہ اعراف کی ۱۱۱ ویں آیت میں حضرت موسیٰ و فرعون کی داستان میں

---

۱) ان احادیث سے متعلق مزید آگاہی کے لئے ''میزان الحکمۃ'' جلد ۲ ص ۲۳۶ تا ۲۵۱ مطالعہ فرمائیں وہاں پر اس سلسلہ میں مختلف ابواب قائم کئے گئے ہیں جیسے جن لوگوں کو قید کرنا جائز ہے ۔ جن لوگوں کو عمر قید کی سزا دی جا سکتی ہے ۔ قیدیوں کے حقوق جن لوگوں کو قید کرنا حرام ہے وغیرہ ۔ ۔ ۔

استعمال ہوا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا مطلب قید کرنا ہے۔ فرعون کے ساتھیوں نے فرعون کو مشورہ دیا تھا کہ جادوگروں کے آنے تک موسیٰ وھارون کو قید کر دیا جائے:

قالوا ارجه و اخاه وابعث فی المدائن حاشرين

ان لوگوں نے کہا ان کو اور ان کے بھائی (ھارون) کو قید کر لیجیے اور مختلف شہروں میں جمع کرنے والوں کو بھیجئے۔

یہی معنی تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورہ شعراء کی ۳۶ویں آیت میں بھی نظر آتا ہے لیکن اکثر مفسروں نے "ارجاء" کو قید کر لینے کے معنی میں تفسیر نہیں کیا ہے بلکہ اس سے تاخیر کرنا مراد لیا ہے۔ جناب موسیٰ نے فرعون کے سامنے جو معجزے پیش کئے تھے اور فرعون نے اس کے جواب میں جادوگروں سے مقابلہ کرانے کا جو منصوبہ بنایا تھا اس کے پیش نظر بعید نظر آتا ہے کہ فرعون نے حضرت موسیٰ وھارون کو قید کیا ہو۔

بہر حال جو بات یقینی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں کم از کم ایک معاملہ میں قید کرنے کا حکم موجود ہے اور اس آیت میں قید کو لفظ "امساک" کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے:

و اللاتی یأتین الفاحشة من نسائکم فاستشهد وا علیهنّ أربعة منکم فان شهدوا فامسکوهن فی البیوت حتی یتوفّیهنّ الموت أو یجعل الله لهن سبیلا (نساء / ۲۰)

اور تمھاری عورتوں میں سے جو بدکاری کریں ان پر چار مسلمانوں سے گواہی لو اور جب وہ گواہی دیدیں تو انھیں گھروں میں قید کر دو یہاں تک کہ ان کی موت آجائے یا خدا ان کے لئے کوئی راستہ مقرر کرے۔

مفسروں کے درمیان مشہور یہی ہے کہ یہ حکم عورتوں کے سلسلہ میں ہے جو زنا کرتی تھیں اور ابھی زناء کی حد کا قانون نازل نہیں ہوا تھا۔ انھیں عمر قید کی سزا دی جاتی تھی۔ لیکن حد کا قانون آجانے کے بعد یہ سزا کوڑے یا سنگساری میں تبدیل ہو گئی۔

امسکوهنّ فی البیوت حتی یتوفّیهنّ الموت: انھیں گھروں میں بند کر دو یہاں

تک کہ انہیں موت آجائے یا خدا ان کے لئے کوئی راستہ مقرر کرے۔ اس جملہ میں اگر چہ جیل کا تذکرہ نہیں ہے لیکن زندگی بھر گھر میں بند رکھنا، عمر قید ہی جیسا ہے۔

قرآن مجید میں یہی ایک مقام ہے جہاں قید کا حکم نظر آتا ہے۔

جیل، احادیث و روایات میں

حدیثوں میں مختلف جرائم کے لئے قید یا عمر قید کا ذکر ملتا ہے۔

۱) قتل میں معاونت: اگر کوئی شخص کسی کو پکڑ لے اور دوسرا شخص اسے قتل کر دے تو اسلامی فقہ میں قاتل کی سزا موت ہے اور پکڑنے والے کی سزا عمر قید ہے۔ اس سزا کے متعلق ہمارے فقہا کا اجماع اور بے شمار حدیثیں اس سزا کی تصدیق کرتی ہیں۔

حضرت علیؑ سے روایت ہے کہ:

یقتل القاتل و یحبس الاخر حتی یموت غما کما حبسه حتی مات غمّا[۱]

قاتل کو قتل کیا جائے گا اور (پکڑنے والے) دوسرے شخص کو قید کرلیا جائے گا یہاں تک کہ وہ غم واندوہ کے ساتھ مرجائے جس طرح اس نے مقتول کو پکڑا تھا یہاں تک کہ وہ غم واندوہ کے ساتھ مرگیا۔

۲) حکم قتل: اگر کوئی کسی کو کسی بے گناہ کے قتل پر مجبور کرتا ہے یا اسے دھمکی دیتا ہے کہ اگر تم میرے حکم کی نافرمانی کروگے تو میں تمھیں قتل کردوں گا۔ اسلامی فقہ کے مطابق پھر بھی اس شخص کا حکم ماننا جائز نہیں ہے وہ اپنی جان بچانے کے لئے دوسرے کو قتل نہیں کرسکتا کیونکہ تقیہ خونریزی کے سلسلہ میں جائز نہیں ہے۔ "والمأمور معذور" مامور معذور ہے، اسلام اس مورد میں اس مقولہ کو قبول نہیں کرتا۔

اب اگر کوئی شخص اسلام کے قانون کو نظر انداز کرتے ہوئے اس ظالم کی دھمکی سے ڈر کر اپنی جان بچانے کی خاطر کسی بے گناہ کو قتل کردے تو قانون اسلام یہ ہے کہ قاتل کی سزا موت ہے اور حکم دینے والے کی سزا عمر قید ہے۔ امام باقرؑ کا ارشاد ہے:

یحبس الآمر بقتله حتّٰی یموت[۲]

۱) وسائل الشیعہ، جلد ۱۹، ص ۳۵، باب ۱۷، حدیث ۱ ۲) وسائل الشیعہ، جلد ۱۹، ص ۳۲، باب قصاص حدیث ۱